ڈائرکٹوریٹ آف ڈِسٹینس ایجوکیشن، یونیورسٹی آف جموّں، جموّں

کلاس: ایم۔اے	مضمون : اُردو
کورس نمبر: 106 (ترجمہ کا فن)	سمسٹر: اول
یونٹ: I-IV	اکائیاں: 1-12

پروفیسر (ڈاکٹر) شہاب عنایت ملک	ڈاکٹر لیاقت علی
کورس کوآرڈی نیٹر، ایم۔اے۔اردو، ڈی۔ڈی۔ای	انچارج ٹیچر، اردو
صدر شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں	ڈی۔ڈی۔ای، جموں یونیورسٹی، جموں

(c) جُملہ حقوق محفوظ ہیں۔ اِس کتاب کا کوئی حِصّہ کسی شکل میں جموّں یونیورسٹی کی تحریری اِجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔

زیر اہتمام: نظامت فاصلاتی تعلیم، جموں یونیورسٹی، جموں

مضمون نگار:

1۔ ڈاکٹر اعجاز حسین شاہ

لیکچرر، شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں۔ (اکائیاں، 1 سے 10)

2۔ ڈاکٹر لیاقت علی

انچارج ٹیچر، اردو، ڈی۔ڈی۔ای، جموں یونیورسٹی، جموں۔ (اکائیاں 11 سے 12)

اڈیٹنگ: ڈاکٹر لیاقت علی

انچارج ٹیچر، اردو، ڈی۔ڈی۔ای، جموں یونیورسٹی، جموں

SYLLABUS FOR NON-CBCS

Examination to be held in December 2019,2020 and 2021

TITLE OF THE COURSE: THE ART OF TRANSLATION

CREDITS: 4 MAXIMUM MARKS: 100

A. SEMESTER EXAM: 80

B. INTERNAL ASSESSMENT: 2**0**

Objectives:

The purpose of this course is to provide the knowledge of Translation and art of translation to the students, so that students could get their livelihood in the government as well private sector.

UNIT-I

۱۔ اردو میں ادبی ترجمے کی روایت

۲۔ ترجمے کے اصول اور مسائل

۳۔ ترجمے کے تقاضے اور مترجم کی خصوصیات

UNIT-II

۱۔ ترجمہ کا فن اور اس کی قسمیں

۲۔ ترجمہ کی اہمیت اور ضرورت

۳۔ ترجمہ کاری میں فورٹ ولیم کالج، دلی کالج، دارالترجمہ عثمانیہ اور دیگر اداروں کی خدمات

UNIT-III

۱۔ منظوم ترجمہ ۲۔ نثری ترجمہ ۳۔ اردو کے نثری اور منظوم ترجمے میں فرق

۴۔ ترجمے میں اصطلاح سازی کی اہمیت، اصول اور مسائل

UNIT-IV

۱۔ ہندی اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ ۲۔ نظم / نثر (اقتباس)

NOTE FOR PAPER SETTER:

There are four units in the course No: URD-106

This Paper shall be devided in four Units viz Unit-I, Unit-II, Unit-III and Unit-IV. The paper setter shall be set two question from each Unit, the candidates shall be required to attempt one question from each Unit. The total number of questions to be attemted in this Paper shall be 4, which will carry equal marks. Unit wise distribution of marks shall be as Unit-I = 20, Unit-II = 20, Unit-III = 20, Unit-IV=20.Totalis80.Distribution of Internal Assessments shall be two home assignments = 10x2 =20.

Books Prescribed.

1۔	ڈاکٹر قمر رئیس	:	ترجمہ کا فن اور روایت (تاج پبلیشنگ ہاوس دہلی، ۱۹۷۶ء)
2۔	ڈاکٹر خلیق انجم	:	فن ترجمہ نگاری (سرسید بک ڈپو، علی گڑھ، ۱۹۹۰ء)
3۔	ڈاکٹر مجیب الاسلام	:	دارالترجمہ عثمانیہ کی علمی و ادبی خدمات (دہلی ۱۹۹۰)
4۔	ڈاکٹر مجید بیدار	:	دارالترجمہ عثمانیہ کی ادبی خدمات
5۔	ڈاکٹر نثار احمد قریشی	:	ترجمہ روایت اور فن (اسلام آباد ۱۹۸۵ء)
6۔	وحیدالدین سلیم	:	وضع اصطلاحات (اورنگ آباد ۱۹۲۱ء)
7۔	مرزا حامد بیگ	:	مغرب سے نثری تراجم (مقتدرا قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۸ء)
8۔	پروفیسر ظہورالدین	:	فن ترجمہ نگاری

فہرست

اکائی نمبر1۔ اردو میں ادبی ترجمے کی روایت ---------------------------------- 01

اکائی نمبر2۔ ترجمے کے اصول اور مسائل ---------------------------------- 14

اکائی نمبر3۔ ترجمے کے تقاضے اور مترجم کی خصوصیات ---------------------------------- 26

اکائی نمبر4۔ ترجمے کا فن اور اس کی قسمیں ---------------------------------- 34

اکائی نمبر5۔ ترجمے کی اہمیت اور ضرورت ---------------------------------- 54

اکائی نمبر6۔ ترجمہ نگاری میں فورٹ ولیم کالج وغیرہ وغیرہ ---------------------------------- 63

اکائی نمبر7۔ منظوم ترجمہ ---------------------------------- 72

اکائی نمبر8۔ نثری ترجمہ ---------------------------------- 87

اکائی نمبر9۔ نثری اور منظوم ترجمے میں فرق ---------------------------------- 95

اکائی نمبر10۔ ترجمے میں اصطلاح سازی کی اہمیت، اصول اور مسائل ---------------------------------- 115

اکائی نمبر11۔ انگریزی سے اردو ترجمہ ---------------------------------- 121

اکائی نمبر12۔ نظم ونثر (اقتباس) ---------------------------------- 132

اسائنمنٹ سوالات ---------------------------------- 145

اکائی نمبر 1: اردو میں ادبی ترجمے کی روایت

ساخت

1.1 تمہید

1.2 مقاصد

1.3 اُردو میں ادبی ترجمے کی روایت

1.4 عمومی جائزہ

1.5 سوالات

1.6 امدادی کتب

1.1 تمہید

اردو میں باقاعدہ ترجمے کی روایت دوڈھائی سو برس پرانی ہے ۔اس کا آغاز قرآن شریف کے ترجمے اور بزرگوں کے اقوال وہدایات سے ہوا تھا۔ مدرسہ غازی الدین (قیام :۱۷۹۲ء) جو بعد میں ترقی کر کے اورینٹل کالج دہلی بنا جس میں علمی اور تعلیمی سرگرمیوں کے تحت ترجمے کرائے گئے ۔ یہاں شعبہ مشرقیہ میں سنسکرت ،عربی وفارسی کے علاوہ سماجی علوم اور جدید مغربی سائنس کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ فورٹ ولیم کالج ،کلکتہ (قیام: ۱۸۰۰ء) میں اردو زبان وادب اور اس کے علمی وتعلیمی میدان میں ترجمے کے ذریعے ہی ایک انقلاب آیا۔ سائنٹفک سوسائٹی ،علی گڑھ (قیام :۱۹۰۳ء) کے مقاصد میں اردو زبان کو فروغ دینا،اردو میں جدید علوم پر تصنیف وتالیف کا کام کرنا، دنیا کی اہم

کتابوں کے اردو میں ترجمے کرانا تحقیق کے سائنٹفک اصولوں کی مدد سے اردو کے کلاسیکی سرمائے کو ترتیب دینا وغیرہ اہم شاغل شامل تھے۔ یہاں ایک بڑا نام جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) کا آتا ہے جہاں دارالترجمہ عثمانیہ کا قیام ۱۹۱۷ء میں عمل میں آیا۔ جامعہ عثمانیہ میں قدیم وجدید، مشرقی ومغربی علوم وفنون کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ اس مقصد کے پیش نظر دارالترجمہ میں نصاب کی تیاری کے لئے تصنیف وتالیف کا کام شروع ہوا۔ انجمن پنجاب اوراورینٹل کالج لاہور نے بھی متعدد علمی، ادبی اور سائنسی کتابوں کا ترجمہ کر کے انہیں شائع کیا ہے۔ ہندوستان کی مرکزی حکومت کے زیر نگرانی اردو کی ترقی اور بقا کے لئے ترقی اردو بیورو قائم ہوا (قیام: ۱۹۷۱ء) جو آج قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے نام سے جانا جاتا ہے یہاں تعلیم، ادب، سائنس اور دوسرے جدید علوم کی کتابوں کی تیاری اوران کی اشاعت کے علاوہ ترجمے کا کام بھی ہوتا ہے۔

1.2 مقاصد

اس اکائی میں اردو میں ادبی ترجمے کی روایت پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ ترجمہ نگاری کی تعریف ومعنی ومفہوم پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ترجمے کے ابتدائی نمونوں کے خدوخال کو متعین کرتے ہوئے اس کے آغاز وارتقا کا مفصل جائزہ پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اردو میں ادبی ترجمے کی روایت کب اور کس ماحول وعہد میں ہوئی اور کن ارتقائی منازل سے گزرتی ہوئی عصر حاضر تک پہنچی اس پورے منظرنامے پر بحث کی گئی ہے۔ ترجمے سے اردو ادب کو کیا فروغ پہنچا اور کن زبانوں کے معیاری ادب کا اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے اس پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اردو کے نامور مترجم کے ادبی کارناموں پر بھی بحث کی گئی ہے۔ ان مذکورہ باتوں کو اُجاگر کرنا ہی اس اکائی کا مقصد ہے۔

1.3 اردو میں ادبی ترجمے کی روایت

ترجمہ کیا ہے؟ یا اس کے تعریف کن الفاظ میں کی جاسکتی ہے؟ یقیناً یہ ایک اہم سنجیدہ اور دل چسپ سوال ہے اور اس کی حیثیت بھی بنیادی نوعیت کی قرار دی جاسکتی ہے، لیکن بانظر غائر دیکھا اور پرکھا جائے تو یہ کوئی ایسا سادہ اور ہلکا سوال نہیں ہے کہ اس کا جواب چند فقروں میں دے کر کسی کو مطمئن کر دیا جائے۔ یاد رہے کہ یہ فن کسی بھی دوسرے تخلیقی کام سے زیادہ مشکل اور پیچیدہ ہے کیوں کہ ایک خیال کو تخلیق کا جامہ پہنانے والا شاید اتنا زیادہ نہیں سوچتا، جتنا کہ کسی ایک زبان سے دوسری زبان میں اس تخلیق کو منتقل کرنے والا سوچتا ہے۔ تخلیق تو ایک طرح سے جبری اور فطری تقاضے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ مرزا غالب نے کہا ہے:

شعر خود کردہ تقاضائے کہ گردد فن ما

اور شاید اسی لئے ڈاکٹر جمیل جالبی کو فن ترجمہ کے ادق ہونے کا یقین ہے، لکھتے ہیں:

''ترجمے کا کام یقیناً ایک مشکل کام ہے اس میں مترجم، مصنف کی شخصیت، فکر
واسلوب سے بندھا ہوتا ہے۔ ایک طرف اس زبان کا کلچر، جس کا ترجمہ
کیا جارہا ہے، اسے اپنی طرف کھینچتا ہے اور دوسری طرف اس زبان کا کلچر،
جس میں ترجمہ کیا جارہا ہے، یہ دوئی خود مترجم کی شخصیت کو توڑ دیتی ہے۔''

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ ایسا جان جوکھوں والا کام ہے تو پھر اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہی کیا ہے، دراصل یہ کام انسان کی تہذیبی، سماجی، ثقافتی، لسانی، فکری حتیٰ کہ مذہبی ترقی وضرورت ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ جب کوئی انسان کسی دوسرے کو اپنا مدعا اپنے دل کا حال اور مافی الضمیر بیان نہیں کر پائے گا تو وہ کیسے اگلا قدم اٹھانے میں کامیاب ہوگا؟ یقیناً شروع میں ایک دوسرے کی زبان سے نا آشنا لوگ، اشاروں کی زبان میں ایک دوسرے سے ہم کلام ہوتے ہوں گے اور اس دوران ممکن ہے کچھ مخصوص اقسام کی آوازیں بھی وضع کر لی ہوں گی، جن کی مدد سے وہ سماجی

رشتے قائم کرنے میں کامیاب رہے ہوں گے۔لیکن کیا وہ پوری طرح سے اپنے مطالب اور مفاہیم کا سلسلہ قائم کر پائے ہوں گے؟ یقیناً ایسا نہیں ہوا ہوگا۔ چوں کہ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ ادھوری بات سے کبھی بھی مطمئن نہیں ہوتا، اس لئے اس نے پوری بات سننے اور پہنچانے کے لئے اس زبان کو سمجھنے کا فیصلہ کیا ہوگا اور جب زبان سیکھ لی ہوگی تو پھر یہ بھی سوچا ہوگا کہ دوسرے لوگوں کو بھی اس کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا جانا چاہئے، تاکہ ان کو ایسی دشواری اور الجھن پیش نہ آئے، جیسے کہ کبھی انہیں پیش آئی تھی۔بس اسی سوچ نے پھر ترجمہ نگاری کی روایت ڈالی۔ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

''ترجمہ نگاری ایسا دریچہ ہے جس سے دوسری قوموں کی احوال ہم پر کھلتے ہیں''

تواریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ایران کے فرماں روا، بغداد کے عباسی خلفاء اور مصر کے فاطمی خلفا، علم و ادب کے رسیا تھے اور انہوں نے نہ صرف دنیا کے نام ور شہ پاروں کو عربی زبان میں ترجمہ کروایا بل کہ اپنے زیر قبضہ علاقوں میں کتب خانے قائم کر کے منفرد اور قابل تقلید مثالیں بھی قائم کیں۔ بغداد کے بیت الحکمت اور مصر کے بیت الحکم جیسے کتب خانے، اپنی مثال آپ تھے۔یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اردو زبان میں ترجمہ نگاری کی روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود اردو زبان، برصغیر پاک و ہند میں ترجمہ نگاری کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ روایت تقریباً پندرہویں صدی کے نصف آخر میں اپنی ابتدائی شکل میں نظر آتی ہے۔اسی لئے یہ مانا جاتا ہے کہ یہی دور اردو زبان کے آغاز اور ارتقا دونوں لحاظ سے بہت اہم ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ بعض اوقات مترجم کو شارح بننا پڑتا ہے (حالاں کہ ترجمہ اور تشریح دو الگ الگ راستے ہیں) لیکن ایسا عموماً شاعری کے میدان میں ہوتا ہے، کیوں کہ شاعری میں تمثیل، تخیل، علامت، تلمیح، استعارے اور تشبیہ کو ہو بہو منتقل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے، پروفیسر مسکین علی حجازی لکھتے ہیں:

''علمی ادبی اور فنی مواد کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا خاصا
دشوار کام ہے، یہ کام وہی شخص صحیح طور پر کر سکتا ہے جو متعلقہ علم، صنف ادب یا
فن کا ماہر ہونے کے علاوہ دونوں زبانوں پر مکمل طور پر قادر ہو۔''

ایک عام رائے یہ بھی ہے کہ سولہویں اور خصوصاً سترہویں صدی کا زمانہ جنوبی ہند میں عہد زریں کہلانے کا مستحق ہے۔اس زمانے میں ترجمہ نگاری اور اردو زبان دونوں حوالے سے ایسے ایسے شاہ کار تخلیق ہوئے کہ جن کی اہمیت آج بھی مسلمہ ہے۔اس دور میں تمام تراجم مشرقی زبانوں سے کیے گئے جن میں فارسی ،عربی ،سنسکرت اور برج بھاشا وغیرہ شامل ہیں۔مغلوں کے عہد میں سرکاری اور مقامی ضرورتوں کی وجہ سے مختلف زبانوں سے فارسی میں اور فارسی سے ان زبانوں میں لازمی طور پر تراجم ہوتے ہوں گے لیکن مغل بادشاہوں نے ہندوستانی ادب کی طرف بھی خاص طور سے توجہ کی۔اکبر کے دور میں ایسے ہندؤں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو فارسی سے بخوبی واقف تھے۔کہا جاتا ہے کہ اکبر کو سنسکرت سے خاص لگاؤ تھا۔اس لئے سنسکرت سے شاعری ،فلسفہ، ریاضی اور الجبرا وغیرہ کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کروایا۔اکبر ہی کے عہد میں کئی علماء نے مل کر مہابھارت کا فارسی ترجمہ کرنا شروع کیا جو ۱۵۹۱ء میں مکمل ہوا۔لیلاوتی ، نل ومن ،تاجک اور بری ہنس وغیرہ کے تراجم تیار ہوئے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ ان ترجموں کی تیاری میں برہمن اور مسلمان عالم دونوں برابر کے شریک تھے۔ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

> ''ترجمے کا کام صرف ہندوستان تک ہی محدود نہیں تھا، دوسری ہجری کے وسط میں ہندوستان سے باہر کے مسلمانوں کے ہندوستان سے علمی تعلقات قائم ہو چکے تھے۔۷۷۷ء میں سندھ سے ایک وفد خلیفہ منصور عباسی کے دربار میں گیا تھا۔اس وفد میں ایک ایسے پنڈت بھی شامل تھے جو ہیئت اور ریاضیات کے ماہر تھے۔یہ پنڈت اپنے ساتھ ہیئت کی مشہور کتاب ''سندھانت'' لے گیا تھا۔خلیفہ کو جب اس کتاب کے مندرجات کا علم ہوا تو اس نے اپنے دربار کے ایک ریاضی دان ابراہیم فرازی کو حکم دیا کہ وہ اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کرے جو پنڈت اپنے ساتھ یہ کتاب لے کر بغداد گیا تھا اسے علم ہیئت

میں غیر معمولی مہارت کی وجہ سے بہت عزت حاصل ہوئی۔ بغداد کے دو عالم اور ماہر ہیئت ابراہیم فرازی اور یعقوب بن طارق پنڈت کے شاگرد ہو گئے، ان دونوں شاگروں نے اپنے اپنے طریقے سے ''سدھانت'' کے بنیادی اصولوں کو عربی میں منتقل کیا۔ ہیئت کے علاوہ ریاضی اور دوسرے علوم کی کتابوں کا بھی عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ان میں دو کتابیں بہت اہم ہیں۔ایک ''کلیلہ ودمنہ'' اور دوسری ''بوزاسف وبلوہر'، کلیلہ ودمنہ ''پنچ تنتر'' کا ترجمہ ہے۔کہا جاتا ہے کہ ساسانیوں کے عہد میں ان دونوں کتابوں کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ دنیا کی بہت سی ترقی یافتہ زبانوں میں عربی سے ان کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔''

اردو زبان میں ترجمہ نگاری کے حوالے سے سب سے پہلی کتاب ''نشاۃ العشق'' ہے۔ یہ ایک صوفی بزرگ عبداللہ حسینی (جو حضرت بندہ نواز گیسو دراز کے پوتے تھے) نے اردو میں ترجمہ کی لیکن اس سے بھی بعض محققین سخت اختلاف رکھتے ہیں۔ان کے خیال میں یہ کہنا اور ثابت کرنا قدرے مشکل ہے کہ اردو میں پہلا ترجمہ کون سا ہے۔ان کے خیال میں شاہ میراں جی خدانما نے ابو الفضائل عبداللہ بن محمد عین القضاۃ ہمدانی کی تصنیف ''تمہیدات ہمدانی'' کا عربی سے اردو میں جو ترجمہ کیا تھا، وہ اردو کا پہلا ترجمہ ہے۔بعض اس کو بھی نہیں مانتے ان کے خیال میں ملا وجہی نے پہلی بار شاہ جی نیشاپوری کی فارسی تصنیف ''دستور عشاق'' کا اردو میں ترجمہ ''سب رس'' کے نام سے کیا۔۱۷۰۲ء شاہ ولی اللہ قادری نے شیخ محمود کی فارسی تصنیف ''معرفت السلوک'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔اٹھارہویں صدی عیسوی کے شروع میں سید محمد قادری کی فارسی تصنیف ''طوطی نامہ'' کا ترجمہ ہوا۔تقریباً اسی زمانے میں فضل علی فضلی نے ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب ''روضۃ الشہدا'' کا اردو ترجمہ ''کربل کتھا'' کے نام سے کیا۔ان ترجموں کے بارے میں یہ بات ذہن

میں رہے کہ یہ کوئی باقاعدہ ترجمے نہیں، بل کہ کتابوں کی تلخیص یا آزاد ترجمے ہوتے تھے اور ماہرین کے نزدیک ان ترجموں میں ان سائنسی اصولوں کی پابندی نہیں کی گئی جو اچھے ترجموں کے لئے ازبس ضروری ہے۔

دیکھا جائے تو عادل شاہی دور میں بھی ترجمہ نگاری خوب پھلتی پھولتی نظر آتی ہے۔اس دور کے اہم شاعر رستمی کی نظم ''خاور نامہ'' دراصل ایک فارسی نظم کا ترجمہ ہے۔مگر رستمی نے کمال خوب صورتی اور مہارت سے ترجمہ کر کے اسے اپنا بنالیا۔اس کا زمانہ تصنیف ۱۴۴۹ ہے۔اسی طرح اس عہد کے ایک دوسرے شاعر ملک خوش نود کی مثنوی ''ہشت بہشت'' خاصی مشہور ہے۔یہ نظم امیر خسرو کی فارسی نظم پر مشتمل ہے۔پھر ''مقیمی'' جو فارسی شاعر تھا، نے ایک ہندی لوک کتھا ''چندر بدن مہیار'' بڑے دل کش اسلوب میں لکھی ہے۔۱۵۵۲ء میں علی عادل شاہ ثانی برسر اقتدار آیا اس کے عہد میں بیجاپور کے باکمال شاعر ''نصرتی'' کے ڈنکے بجے۔مثنوی کی ہیئت میں اس کی تین کتابیں بہت مشہور ہوئیں، جن میں سے ''گلشن عشق'' اور ''علی نامہ'' کو آج بھی سراہا جاتا ہے۔ بیجاپور کے ایک نابینا شاعر ''ط ہاشمی'' کی تصنیف ''یوسف وزلیخا'' جو ایک آزاد ترجمہ ہے بھی ایک اہم چیز ہے۔اسی طرح قطب شاہی دور میں ترجمہ نگاری پر اچھا کام ہوا۔اس دور میں ملا وجہی، محمد قلی قطب شاہ کے عہد کا بہت اعلیٰ پائے کا نثر نگار اور شاعر تھا۔۱۶۳۵ء میں ملا وجہی نے اپنی شہر آفاق ''سب رس'' ترجمہ کی۔اس کا اسلوب مقفی ہونے کے باوجود سادہ و پرکار ہے۔اس ترجمہ کو دیکھ کر ڈاکٹر سید عابد حسین عابد کی حقانیت پر بے اختیار ایمان لانے کو دل چاہتا ہے۔لکھتے ہیں:

> ''ترجمے کو ادبی قدر و قیمت اس وقت حاصل ہوتی ہے، جب ایک زبان سے دوسری زبان میں مفہوم کے ساتھ وہ آب و رنگ، وہ چاشنی، وہ خوش بو، وہ مزا بھی آجائے، جو اصل عبارت میں موجود تھا۔''

قطب شاہی دور کا ایک اور بڑا شاعر ''غواصی'' تھا۔اس کا مقام ''ملک الشعراء'' جیسا تھا۔اس کی مشہور تصانیف ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' اور ''طوطی نامہ'' ۱۶۳۱ء میں لکھی گئی۔طرز بیان میں سادگی اور کمال کی روانی ہے۔اس

دور کا ایک اہم شاعر ''ابن نشاطی'' ہے۔اس کی مثنوی ''پھول بن'' دکنی اردو کے خزینہ ادب کا ان مول رتن کہانی ہے۔ ''پھول بن'' فارسی تصنیف ''بساتین'' پر مشتمل ہے۔لیکن شاعر کی بے پناہ تخلیقی صلاحیت اور فن کاری نے اس داستان کی پیچیدہ کہانی کو اپنا بنالیا ہے۔عیسائیوں نے جب ہندوستان میں تاجروں کے بھیس میں قدم رکھا تو ان کے مبلغین نے اپنی مذہبی کتابیں ترجمہ اور تالیف کر کے شائع کیں۔اٹھارویں صدی کے وسط میں انہوں نے عیسائیت کے پرچار اور فروغ کے لئے توریت اور انجیل کے اردو ترجمے شائع کئے۔کہا جاتا ہے کہ اس سلسلے کی پہلی کتاب ''کتاب پیدائش'' کے پہلے چار بابوں کا ترجمہ ہندوستانی ہے۔یہ ترجمہ بنجمن شولٹز Benjamain Schultze نے کیا تھا۔اس کے بعد اسی شولٹز نے ''کتاب دانیال'' کا اردو ترجمہ شائع کیا۔(ان کتابوں کی فہرست سی اے گیریرسن'' نے اپنی کتاب ''ہندوستان کا لسانی جائزہ'' جلد نہم میں دی ہے۔

اٹھارویں صدی کے خاتمے سے کچھ پہلے دلی میں قرآن شریف کے دو ترجمے ہوئے۔یہ مشہور بزرگ شاہ ولی اللہ کے دو صاحب زادوں مولانا شاہ رفیع الدین اور ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر نے کیے۔دونوں ترجموں میں ۹ سال کا فرق ہے۔شاہ رفیع الدین کا لفظی ترجمہ تھا اس میں ہر لفظ کا ترجمہ اس طرح کیا گیا کہ اردو فقروں کی ساخت بالکل بدل گئی۔چوں کہ سلاست اور روانی نہ تھی اس لئے اس کا اصل مفہوم سمجھنے میں دقت ہوتی تھی۔یہ ترجمہ ۱۷۸۶ء میں ہوا تھا۔عبدالقادر کا ترجمہ ۱۷۹۵ء میں ہوا، پہلے کے مقابلے میں زیادہ آسان، شگفتہ، سلیس اور رواں تھا ان تراجم کا مقصد صرف یہ تھا کہ جو لوگ عربی زبان سے ناواقف ہیں، وہ بھی اس مقدس کتاب کو سمجھ لیں، پڑھ لیں، یہ ابتدائی مساعی ادبی نہیں تواریخی زمرے میں زیادہ شمار کی جاتی ہے۔مذہبی کتابوں کے علاوہ ۱۷۷۵ء میں فارسی داستان ''قصہ چہار درویش'' کا ترجمہ حسین عطا تحسین نے کیا۔کتاب کا نام ''نوطرز مرصع'' ہے۔تحسین فارسی کی کئی کتابوں کے مصنف تھے۔لیکن اردو ادب میں اس ترجمے کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔اس دور کی ایک کتاب ''بہادر نامہ'' بھی ملتی ہے۔ جس میں سرنگاپٹم کی تواریخ ٹیپو سلطان کی جنگ تک جاتی ہے۔خیال ہے کہ یہ بھی کسی فارسی تصنیف کا حصہ یا ترجمہ ہے۔

اس طرح پنڈت دیا شنکر کول کا نام ان کی تصنیف ''گلزار نسیم'' کی وجہ سے زندہ رہے گا۔ یہ مثنوی لکھنؤی طرز تحریر کی نمائندہ مانی جاتی ہے۔ پنڈت جی نے ''لیلہ والف لیلی'' کی کچھ کہانیوں کا ترجمہ بھی کیا، مگر لازوال شہرت ان کی مترجمہ مثنوی ''گلزار نسیم'' کی وجہ سے نصیب ہوئی۔ یہ بہت طویل مثنوی پنڈت جی کے استاد آتش کے کہنے پر مختصر ہوئی۔ اس مثنوی کا اردو ادب میں جو مقام و مرتبہ ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔

اردو ادب کے طالب علموں کو معلوم ہونا چاہئے کہ علامہ اقبال کی کئی شہرہ آفاق نظمیں بھی غیر ملکی ادب سے اخذ شدہ ہیں۔ ان میں ''ماں کا خواب''، ''بچے کی دعا''، ''ایک مکڑی اور مکھی''، ''ایک گائے اور بکری''، ''ایک پہاڑ اور فیلو''، ''عشق اور موت'' (ماخوذ از ٹینی سن) ''رخصت اے بزم جہاز'' (ماخوذ از ایمرسن'' وغیرہ۔

آخر میں یہی کہنا ہے کہ ادبیات میں تراجم کا سلسلہ رکا نہیں ہے، اب دیکھنا بس یہ ہے کہ موجودہ دور اور مستقبل میں ترجمے کے ہمہ گیر ادبی و تمدنی اثرات کو کس طرح قبول کیا جاتا ہے۔

ترجمہ کی روایت میں ادبی اداروں کا ایک اہم اور قابل ستائش رول رہا ہے۔ عہد قدیم کے ہندوستان میں اشوک کے زمانے میں دارالترجمہ قائم کیا گیا تھا۔ اکبر کے عہد میں آگرے میں، نظام کے دور میں حیدرآباد میں انگریزوں کے وقت میں فورٹ ولیم کالج میں مختلف زبانوں سے ترجمے کئے گئے جس کی وجہ سے ادب اور تہذیب و تاریخ کا علم فارسی اور اردو میں منتقل ہوا۔ اردو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کو باقاعدہ ادبی اظہار کی زبان بنانے میں ترجموں کا بڑا ہاتھ ہے۔ ابتدائی دور میں اسے کوئی ادبی اظہار کی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ اس زبان میں ترجمے ان معنوں میں شروع ہوئے کہ خیال اور نفس مضمون کو منتقل کرنے کے ساتھ ساتھ تصورات اور لفظوں کا استعاراتی اور معنیاتی نظام بھی فارسی اور عربی زبانوں سے اردو میں لے لیا گیا اور اس طرح اس کا اپنا ادبی پیرایۂ اظہار صرف ایک صدی کے عرصے میں وجود میں آ گیا۔

اردو میں ترجمے کی روایت ابتدائی دور ہی سے پڑ گئی تھی گو کہ اس کو ترجمے کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ مثلاً اردو شاعری

کو ہی لیجئے ابتدائی دور کی اردو شاعری یعنی اٹھارہویں صدی کے موضوعات، مفاہیم ،شاعرانہ تصورات، تراکیب اور استعاراتی نظام تمام فارسی شاعری سے مستعار نظر آتا ہے۔نثری کتب میں بھی اردو کی کا سیکی نثر کی بیش تر کتابیں فارسی اور سنسکرت سے ماخوذ ہیں۔ ملاوجہی کی ''سب رس''، فضلی کی ''کربل کتھا''، عطاحسین خاں تحسین کی ''نوطرز مرصع'' میرامن کی ''باغ و بہار'' اور گنج خوبی وغیرہ بے شمار داستانیں ایسی ہیں جو ترجمہ سمجھی جاتی ہیں۔

دوسرا اہم میدان جہاں ترجموں کا باقاعدہ آغاز ہوا وہ مذہب تھا۔مشنری اداروں نے مذہبی تبلیغ کے پیش نظر مذہبی کتب کے ترجمے کا کام اٹھارہویں صدی کے وسط ہی میں شروع کر دیا تھا۔ پادر بنجمن شلز نے ۱۷۴۸ء میں انجیل کا ترجمہ اردو میں کیا۔اس کے علاوہ قرآن، احادیث اور اسلام سے متعلق عربی اور فارسی کتب کے تراجم کا ایک بڑا ذخیرہ بھی اٹھارہویں صدی میں جمع ہو گیا۔

اس دور میں مذہبی کتب کے تراجم کے علاوہ ایک اہم ادبی ترجمہ نوطرز خاں نے کیا تھا۔نوطرز مرصع کا اسلوب مقفیٰ ،رنگین اور مشکل ہے۔فارسی اور عربی زبان کے مشکل الفاظ اس میں شامل ہیں، اور صنائع کا استعمال اتنی کثرت سے ہوا ہے کہ عام بول چال کی اردو جاننے والا کوئی شخص اسے نہیں سمجھ سکتا۔اس دور میں دیگر علوم کی کتابوں کے ترجمے بھی ملتے ہیں۔اردو تراجم کے اہم اداروں کا تعارف ذیل میں درج ہے۔

فورٹ ولیم کالج:

انگریز ملازمین کو ہندوستانی زبانوں کی تعلیم دینے کے لئے ۴ مئی ۱۸۰۰ء میں لارڈ ویلزلی نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ڈاکٹر جان گلکرسٹ اس میں ہندوستانی زبان کے شعبے کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔انہوں نے تعلیم کے بندوبست کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا ایک شعبہ بھی کھولا اور کتابوں کی اشاعت کے لئے ایک دارالاشاعت قائم کیا۔

ورناکلرٹرانسلیشن سوسائٹی:

ورناکلر سوسائٹی کا قیام دہلی کالج میں اردو ذریعہ تعلیم کے تدریسی مواد یا نصاب کی ضرورت کی وجہ سے عمل میں آیا۔ یہ سوسائٹی ۱۸۴۲ء میں قائم ہوئی اور غدر سے پہلے اس نے گیارہ کتابیں ترجمے اور تصنیف وتالیف کے ذریعہ تیار

کر لی تھیں۔اس سوسائٹی نے ریاضی، سائنس، نجوم، منطق، اور فلسفے کو اپنے ترجموں کے منصوبوں میں شامل کیا۔

سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی:

سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں پڑی۔ بعد میں اس کا دفتر سرسید کے تبادلے کے ساتھ علی گڑھ منتقل ہو گیا۔ اس ادارے کا بڑا کارنامہ اردو میں انگریزی کی کتابوں کے ترجمے کر کے نئی فکر اور نئے علوم سے قوم کو روشناس کرانا تھا۔ ہندوستانی زبانوں میں نئے علوم کا ترجمہ کرنا ویسے بھی سوسائٹی کے بنیادی مقاصد میں شامل تھا۔

دارالترجمہ عثمانیہ:

۲۶/اپریل ۱۹۱۷ء کو عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کی کاروائی شروع کرنے کا فرمان جاری ہوا۔ ۱۹۱۹ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور یہ طے پایا کہ اس میں ذریعہ تعلیم اردو ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اعلیٰ تعلیم کی درسگاہ کے نصاب کے لئے اردو میں کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ سامنے تھا اس لئے ۱۴/اگست ۱۹۱۷ء کو دارالترجمہ قائم کرنے کا فرمان جاری ہوا اور یکم ستمبر ۱۹۱۷ء کو مولوی عبدالحق کی نظامت میں شعبہ تالیف و ترجمہ قائم کیا گیا اور کام کرنا شروع کیا۔ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آنے کے بعد سبھی ڈگری کورسوں مثلاً قانون، سوشیالوجی، طب یونانی، میڈیسن، انجینئرنگ، ریاضی، الجبرا، جیومیٹری وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ دارالترجمہ نے ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۸ء تک مسلسل کام کیا۔

1.4 عمومی جائزہ

ترجمہ ایک زبان کی ساخت میں موجود معنی و مضمون کو دوسری زبان کی ساخت میں منتقل کرنے کا عمل ہے۔ ترجمے کی عمومی تعریف یہی ہے لیکن اگر ہم اپنی روزمرہ کی سماجی زندگی کا مطالعہ و مشاہدہ کریں تو ہم پر یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ترجمے کا عمل ایک زبان میں بھی جاری رہتا ہے یعنی جب ہم اپنے یا دوسروں کے معنی و مطالب کو ان کے اصل الفاظ کے بجائے دوسرے الفاظ میں بیان کرتے ہیں تو اس وقت بھی ہم ترجمے کے عمل سے دوچار ہوتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ اردو زبان مشترکہ تہذیب وثقافت کی پیداوار اور علمبردار ہے۔ ہندوستان میں اس مشترکہ تہذیب کا آغاز محمود غزنوی کی آمد سے ہوتا ہے۔ اس عہد میں فارسی، پشتو، ترکی، عربی، اور ہندوستانی کی آمیزش سے ایک نئی تہذیب اور نئی زبان کا ہیولا تیار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دو زبانوں اور دو تہذیبوں کا تعامل اپنی سادہ شکل میں ترجمے کے فروغ کا باعث ہوتا ہے اور ترجمے کی وجہ سے ہی مشترکہ زبان اور نئے اسلوب وجود میں آتے ہیں۔ جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ایک بالغ لسانی گروہ بازار یا دوسری عملی ضرورتوں کے تحت اجنبی زبان کو ایک معصوم بچے کی طرح انگیز نہیں کرتا بلکہ وہ اجنبی زبان کی ساخت کو اپنی لسانی ساخت کے مطابق اور اس کے مزاج کی ہم آہنگی سے قبول کرتا ہے یعنی ایک لسانی گروہ کے لئے کتے کے معنی کتا، ایک مخصوص جاندار یا جانور کے ہیں جب کہ دوسرے لسانی گروہ کے لئے کتے کے معنی پہلے Dog کے ہیں بعد میں مخصوص جانور اس لحاظ سے ایک لسانی گروہ کے دوسری زبان کو سیکھنے اور سمجھنے کے عمل میں ترجمے کی اہمیت وافادیت مسلم ہے۔ بقول عبدالحق ہماری زبان میں لسانی سطح پر مترادفات سے ترجمے کا آغاز ہوا۔ ان مترادفات میں تصرف بھی ہوئے۔ گویا اردو کے عناصر ترکیبی میں ترجمے کا خمیر شامل ہے۔ اس لحاظ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو زبان میں ترجمے کی تاریخ وابتدا اردو زبان کی تاریخ وابتدا سے منسلک ہے۔

اردو ادب میں باقاعدہ شعری ترجمے کا آغاز گولکنڈہ کے فرمان روا محمد قلی قطب شاہ کے عہد (۱۵۸۰۔۱۶۱۱) اور اس کی شاعری سے ہوتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں دکنی ادیبوں اور شعرا کا فارسی کی طرف زیادہ رجحان تھا جس کے نتیجے میں اس عہد میں ترجمے پر بھی باقاعدہ توجہ دی گئی۔ جمیل جالبی کے مطابق قلی قطب شاہ نے حافظؔ کی غزلیں اردو میں ترجمہ کی ہیں۔ اسی عہد میں شیخ احمد گجراتی نے مولانا جامؔی اور امیر خسروؔ کی فارسی مثنویوں ''یوسف زلیخا'' کا ترجمہ اسی عنوان سے مثنوی کی صورت میں سن ۱۵۸۰ء سے ۱۵۸۸ء کے درمیان میں کیا ہے۔ ۱۶۳۱ء میں غواصیؔ نے ''ہتو پدیش'' کے نجشیؔ کے فارسی ترجمے ''طوطی نامے'' کا اسی عنوان سے اردو میں ترجمہ کیا۔ ۱۶۴۰ء میں بیجاپور کے سلطان محمد عادل شاہ کی فرمائش پر ملکؔ خوشنود نے فارسی مثنوی ''یوسف زلیخا'' اور امیر خسروؔ کی مثنوی ''ہشت بہشت'' کا ترجمہ ''جنت سنگھار''

کے عنوان سے کیا۔

۱۶۴۰ء میں کمال خاں رستمی کا ترجمہ ''خاورنامہ'' جو اردو کی سب سے طویل مثنوی ہے جو ۲۴ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ مثنوی اردو کے شعری تراجم میں بہت اہم اور اصل کے مطابق ہے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کے قیام کے بعد اردو میں مغرب کے تخلیقی ادب کے تراجم کا آغاز ہوا۔ اردو میں باقاعدہ اینتھولوجی انتخاب کا آغاز ضامن کنتوری کی کتاب ''ارمغان فرنگ'' سے ہوا جو ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔ بیسویں صدی میں انگریزی کے ساتھ مغرب کی دوسری زبانوں کے شعر و ادب کے ترجمے پر بھی زیادہ توجہ دی گئی۔ بیسویں صدی میں معنی و خیال پر زیادہ زور دینے کی وجہ سے بیشتر انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں کی شاعری کا ترجمہ نثر میں کیا گیا۔ نظم کی اس قلب ماہیت کے باوجود شعری تاثر کافی حد تک قائم رہتا ہے۔

1.5 نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال نمبر 1: ترجمہ نگاری کے ابتدائی خدوخال متعین کیجئے۔

سوال نمبر 2: اردو میں ترجمہ نگاری کی روایت پر روشنی ڈالئے

سوال نمبر 3: اردو ترجمہ نگاری کے فروغ میں ادبی اداروں کا کیا رول رہا۔ وضاحت کیجئے؟

1.6 امدادی کتب

1۔ فن ترجمہ نگاری مرتبہ خلیق انجم

2۔ فن ترجمہ نگاری، پروفیسر ظہور الدین

3۔ ترجمہ کا فن اور روایت۔ قمر رئیس

4۔ اردو ترجمے کی روایت (1786ء تا حال) مرزا حامد بیگ

اکائی نمبر 2: ترجمے کے اصول اور مسائل

ساخت

2.1 تمہید

2.2 مقاصد

2.3 ترجمہ کے اصول ومسائل

2.4 عمومی جائزہ

2.5 سوالات

2.6 امدادی کتب

2.1 تمہید

ترجمہ ایک مشقت طلب کام ہے۔ دوسرے فنون کی طرح اس فن میں بھی مہارت حاصل کی جاتی ہے۔ ترجمے کی کئی قسمیں ہوتی ہیں جسے سمجھنے کے لےء دہری تہری صلاحیت کی ضرورت پڑتی ہے۔ ترجمے کے وقت متن کی زبان اور اپنی زبان پر عبور لازمی ہے اور موضوع سے بھی طبعی مناسبت ضروری ہے۔ علمی اور تکنیکی ترجمے میں عمومی آگہی اور ذہنی میلان پیدا ہونا چاہئے۔ مشینی ترجمے کو کمپیوٹر کی مدد سے آسان بنایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس تخلیقی ترجمہ بہت مشکل ہے۔ جب متن موزوں، مناسب اور مطابقت کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے تو بڑا ترجمہ جنم لیتا ہے۔

2.2 مقاصد

اس اکائی میں ترجمہ نگاری کے اصول اور مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ترجمے کے وقت مترجم کی کیا ذمہ داریاں ہوتی ہیں؟ اصل متن کیا ہے؟ یہ معلوم ہونے کے بعد ہی مترجم اپنی ذمہ داریاں نبھاتا ہے۔ یہاں لفظ اور صطلاح کے درمیان فرق کو بھی بتایا گیا ہے۔ یہی باتیں سمجھانا اس اکائی کا مقصد ہے۔

2.3 ترجمہ کے اصول اور مسائل

ترجمہ ایک زبان میں ادا کردہ مفہوم کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا نام ہے۔اس میں الفاظ اور معانی دونوں کا لحاظ کیا جاتا ہے ۔ترجمہ کرتے وقت اصل زبان کے الفاظ کے مناسب مترادفات (ہم معنی الفاظ) تلاش کرنا اور جملوں کا بندوبست ذہن میں رکھتے ہوئے جملے ترتیب دینا ترجمہ کے لئے لازمی شرط ہے۔اس کے علاوہ اصل زبان کے مفہوم کو ترجمے کی زبان میں اس طرح اتارنا کہ اصل زبان کے پڑھنے والے پر جو تاثر قائم ہوتا ہے وہ ترجمے کے قاری پر بھی طاری ہو جائے ،ترجمہ نگاری کی کامیابی کی دلیل ہے۔

اس لئے کہا جاتا ہے کہ محض دولسانی لغت (Bilingual Dictionary) کی مدد سے ترجمہ کرنا اس فن سے ناواقفیت کا ثبوت دیتا ہے۔ترجمے کے لئے ضروری ہے کہ اصل زبان اور ترجمے کی زبان دونوں پر عبور حاصل ہو۔ دونوں زبانوں کے الفاظ کے محل استعمال ،ان کی معنویت اور تہہ داری ، ان کے تہذیبی وسماجی سیاق اور ان کے اشتقاق (etymology) سے گہری واقفیت حاصل ہو۔ دونوں زبانوں کے محاوروں، کہاوتوں اور روز مرہ سے بھی اچھی واقفیت ضروری ہے۔دونوں زبانوں کے تاریخی ،لسانی اور ثقافتی پس منظر کا مطالعہ اور دونوں زبانوں کے ادب سے ماہرانہ واقفیت بھی لازمی ہے۔اگر کوئی مترجم ان خصوصیات کا حامل نہ ہو تو اسے بقول ظ انصاری ''ترجمے کی اوکھلی میں سر نہیں دینا چاہئے''۔

ترجمے میں ایک زبان کے متن کو دوسری زبان میں جوں کا توں پیش کرنا ہوتا ہے ۔گویا ترجمہ اصل سے مطابقت کا حامل ہونا چاہئے ۔ یہ مطابقت لفظ و معنی کے ساتھ اس تاثر سے بھی ہونی چاہئے جو اصل مصنف کے پیش نظر ہوتا ہے۔یعنی ترجمہ منشائے مصنف کے مطابق ہونا چاہئے لیکن دو مختلف زبانوں کی صرفی ونحوی خصوصیات ،لسانی مزاج، تہذیبی عناصر اور خود مصنف کی تخلیقی صلاحیت اور ترجیحات کے سبب یہ مطابقت سو فی صد نہیں ہوتی اور ترجمے میں کوئی نہ کوئی پہلو تشنہ رہ جاتا ہے۔اس اعتبار سے ترجمہ ایک ناگزیر سمجھوتا ہوتا ہے۔

جب اصل زبان سے براہ راست ترجمہ کرنے کے بجائے کسی دوسری زبان میں ترجمہ شدہ متن کو اپنی زبان میں منتقل کیا جاتا ہے تو یہ ترجمہ اصل سے اور بھی دور ہو جاتا ہے اور بعض اوقات اس قدر منحرف ہو جاتا ہے کہ اس میں اصل کی بو باس تک باقی نہیں رہتی۔ ایسے میں اس ترجمے کو ایک نا قابل قبول سمجھوتا سمجھنا چاہئے۔

ہاں کسی اور زبان سے ترجمہ کرنے والا مترجم اگر اصل زبان سے واقف ہو یا کسی اہل زبان سے مشورہ کر کے ترجمہ کرے تو یہ ترجمہ قابل قبول ہوسکتا ہے۔ مثلاً رابرٹ لوویل (Robert Lowell) اور آڈن (Auden) نے جو روسی زبان نہیں جانتے تھے، روسی کے ماہرین یا اہل زبان روسیوں سے مشورہ کر کے روسی ادب کے انگریزی میں اچھے ترجمے کیے ہیں۔ لیکن ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ اس کے باوجود ترجمے کی ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر ثانوی زبان سے کیے گئے ترجمے کو بھی قابل قبول قرار دیا گیا ہے۔ ساہتیہ اکادمی اور نیشنل بک ٹرسٹ کے زیادہ تر تراجم اسی نوعیت کے ہیں۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ترجمہ کرتے وقت اصل زبان کو ماخذ زبان (Source Language) اور اس کے متن کو ماخذ متن (Source text) کہا جاتا ہے۔ جس زبان میں ترجمہ کرنا ہوا سے مطلوبہ زبان (Target Language) اور اس کے ترجمے کو مطلوبہ متن (Target Text) کہا جاتا ہے۔ ثانوی زبان کے لئے (Filter language) کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ ترجمہ اگرچہ تخلیق نہیں ہوتا مگر ایک کامیاب مترجم اصل فن پارے کو اپنی زبان میں دوبارہ تخلیق کرتا ہے۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

> ''خلاقانہ ترجمہ وہ ہے جو اصل فن پارے کی شخصیت کو منہدم نہیں کرتا اور ترجمے والی زبان میں پہلے سے موجود ادب مختلف معلوم ہوتا ہے لیکن ترجمے والی زبان بولنے والوں کے لئے قابل قبول اور قابل فہم ہوتا ہے۔''

فن ترجمہ کی بحث میں زیادہ تر اس ترجیح پر گفتگو ہوتی ہے جو تخلیقی ادب سے متعلق ہو۔ لیکن غیر تخلیقی ادب خصوصاً

تکنیکی وسائنسی متن کا ترجمہ بھی کم اہمیت کا حامل نہیں ہوتا اور اس میں بھی اصل متن کی بازیافت (بازتخلیق) نہ سہی، اہمیت رکھتی ہے۔ ایسے تراجم میں اصطلاحات اور تکنیکی اظہارات کی بھرمار ہوتی ہے اس لئے کمپیوٹر کی آمد کے بعد مشینی ترجمہ بھی مقبول ہوتا جارہا ہے۔ کمپیوٹر میں مختلف زبانوں کے مترادفات اور گرامر کو فیڈ کر کے اس طرح پروگرامنگ کی جاتی ہے کہ کمپیوٹر پر کام کرنے والے کے اشارے پر کمپیوٹر ایک زبان کے الفاظ اور جملوں کی دوسری زبان (یعنی ماخذ زبان سے مطلوبہ زبان) کے الفاظ اور جملوں میں بدل دیتا ہے۔ یہاں تک کہ زبان کی ساخت، جملوں کی بناوٹ، محاوروں کے محل استعمال اور اجزائے کلام وغیرہ کو کارپس (Corpus) کی تکنیک کی مدد سے پہچان کر پیچیدہ ترجمہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

ترجمے کو مطابق اصل بنانے کے لئے ضروری ہے کہ الفاظ و معنی پر یکساں توجہ دی جائے۔ ساتھ ہی لفظوں کے علامتی استعمال کو بھی دھیان میں رکھا جائے۔ اصل مصنف کے اسلوب کی پیروی کی جائے۔ اصل متن سے قائم ہونے والے تاثر کو ترجیح کی زبان کے قاری تک پہنچایا جائے۔ ان شرائط کی تکمیل کے لےء ترجمہ نگاری کے مندرجہ ذیل اصولوں کی پابندی ضروری ہے۔

1۔ اصل زبان (مثلاً انگریزی) کے ہر لفظ کے لئے ایک لفظ چنا جائے اور سارے ترجمے میں اس لفظ کی پابندی کی جائے۔

2۔ اصل زبان کے لفظ کی طرح اس کے متبادل لفظ میں بھی توسیعی شکلیں یا مشتقات وضع کرنے کی گنجائش ہونی چاہئے۔

3۔ ترجمے کی زبان میں اصل زبان کا لفظ رائج ہو تو اسے جوں کا توں استعمال کیا جائے۔

4۔ اصل زبان کے لفظ کے ساتھ ترجمے کی زبان کا لفظ بھی عام طور پر مستعمل ہو تو اسے اصل زبان کے لفظ پر ترجیح دینی چاہئے۔ مثلاً لائبریری کی جگہ کتب خانہ، کمیٹی کی جگہ مجلس۔

5۔ اصطلاح کا ترجمہ اصطلاح سے کیا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہو تو اصطلاح وضع کی جائے۔

6۔ وضع کی ہوئی اصطلاح من گھڑت یا ناقابل فہم نہ ہو اور اصل زبان کی اصطلاح قابل فہم ہو تو اسے برقرار رکھا جائے مثلاً لاؤڈ اسپیکر، ریڈیو۔

7۔ اسمائے معرفہ (Proper Nouns) کے سلسلے میں اصل زبان کے تلفظ کا اتباع لازمی نہیں۔خصوصاً وہ نام جو اردو میں مستعمل ہیں،اصل کے مطابق نہ لکھے جائیں مثلاً ارسطو،سقراط،افلاطون،بطلیموس،اسحاق نیوٹن،سکندر۔ ترجمہ نگاری کے اصولوں کے ساتھ ساتھ ترجمے کے لئے ضروری شرطوں کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا۔دراصل ترجمے کا بنیادی منشا اصل متن کے خیال اور مفہوم کے اسلوب بیان کی حتی الامکان پابندی کے ساتھ ادائیگی ہے۔ اس کے لئے مندرجہ ذیل شرائط کی تکمیل ضروری ہے۔

1۔ جس زبان سے ترجمہ کیا جارہا ہے اس زبان کی لغت سے،محاورات واصطلاحات سے،ادبیات سے اور تاریخی پس منظر سے اچھی واقفیت حاصل ہو۔

2۔ اصل زبان کے فصیح اور غیر فصیح انداز بیان سے اور اس کی علمی اور عوامی سطح سے مناسب واقفیت حاصل ہو۔

3۔ اصل تصنیف یا عبارت کے موضوع کا علم ہو۔

4۔ الفاظ کے استعمال میں اصل مصنف کی پسند وناپسند اور ترجیحات کا شعور ہو۔

5۔ جس زبان میں ترجمہ کرنا ہے اس پر ماہرانہ عبور حاصل ہو۔

ترجمہ ایک مستقل فن علم ہے۔اس کے اپنے اصول وضوابط ہیں جو مسائل کی نوعیّتوں کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ نفیس مضمون اپنی تمام نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ ایک زبان میں منتقل ہوجائے۔ صحت منداور کامیاب ترجمہ اسی صورت میں ممکن ہے، جب ہم لکھنے والے کے ذہن میں سفر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔اس طرح ہم ان کیفیات اور احساسات سے گزر سکتے ہیں، جو تصنیف کا باعث بنی ہیں۔ترجمہ محض ایک جسم کو دوسرا لباس پہنادینے کا نام نہیں بلکہ ایک جسم کے مقابلے میں بالکل ویسا ہی جسم تراش کر اسے دوسرے لباس میں اس طرح سے پیش کرنا ہے جس سے دونوں قالبوں میں ایک ہی روح رواں دواں محسوس ہو۔ترجمے کے وقت مختلف مسائل سامنے آسکتے ہیں اور ان کی نوعیتیں بھی مختلف ہوں گی۔اول الذکر میں اگر شاعری ہے تو مجموعی تاثر، خیال کی شدت،

مرکزی خیال اور تخیل کی پرواز، امیجری کی نوعیت، الفاظ کی نشست و برخاست، صوتی آہنگ، بحری تناسب، اسلوب اور ہیئت وغیرہ سبھی کو ساتھ لے کر چلنا پڑے گا۔ شاعری اور نثر دونوں میں مرکزی خیال اور مجموعی تاثر کو اہمیت حاصل ہے۔ جن پر مترجم کی گرفت مضبوط ہونی چاہئے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب تصنیف و ترجمے کی زبانوں پر ہمیں عبور حاصل ہو۔ ترجمہ کرتے وقت ہر بات کو اس کے سیاق میں دیکھنا چاہئے۔ زبان کی ادبی روایت سے مترجم کی ناواقفیت بھی ترجمے کو مجروح کر دیتی ہے۔ شاعری میں استعمال ہونے والے ان اشاروں، کنایوں، استعاروں اور علامتوں کی جانکاری ضروری ہے جن میں خیال بن سنور کر سامنے آیا ہے۔ لسانی ساخت کے پیچ و خم پر بھی دسترس ہونی چاہئے۔ ان تمام باتوں کے بغیر ترجمے میں اصل مواد کے مرکزی خیال اور مجموعی تاثر کو پیش نہیں کر سکتے۔

ترجمے میں بڑی دقت اس وقت پیش آتی ہے، جب ترجمے کی زبان ان پہلوؤں مثلاً مشاہدات و تجربات، تخیل کی پرواز، خیالات، کیفیات و احساسات کو پیش کرنے سے قاصر رہتی ہے جو تصنیف کی زبان میں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ ترجمے میں تیسری اہم چیز ''شدت'' ہے یعنی جس نوعیت و کیفیت کے ساتھ فنکار نے اپنے خیالات پیش کئے ہیں تقریباً وہی بات ترجمے میں آنی چاہئے۔

کسی بھی موضوع یا قسم کا ترجمہ ہو، ترجمہ کرتے وقت سب سے بڑا مسئلہ اصطلاحات کا ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ مزید شدت اس وقت اختیار کر لیتا ہے، جب ہم مختلف درجوں کے لئے ایسے نصاب تیار کر رہے ہوتے ہیں جو ہمارے لئے بالکل نئے ہوتے ہیں۔ اس مسئلے پر قابو پانے کے لئے مختلف کمیٹیاں بنائی گئیں۔ نئے نئے ادارے قائم ہوئے وضع اصطلاحات کے اصول مرتب ہوئے اور ماہرین علوم اور اساتذہ کے مشوروں، ہدایتوں اور سفارشوں کی روشنی میں یہ کام انجام کو پہنچا۔ اس سلسلے میں اداروں، انجمنوں اور سوسائٹیوں کے نام لئے جا سکتے ہیں جیسے انجمن ترقی اردو علی گڑھ، دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (نئی دہلی) وغیرہ۔

آزادی کے بعد نیا انداز فکر ابھر کر سامنے آیا۔ ہندوستان کی تقسیم کے اثرات اردو زبان پر بھی مرتب ہوئے

جس کی وجہ سے اردو کے سلسلے میں جو بڑے کام ہوئے ہیں، ان میں ایک اصطلاح سازی بھی ہے۔ وضع اصطلاحات کے پرانے اصولوں اور جدید عہد کے تقاضوں اور ضرورتوں کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے اصطلاحات وضع کرنے کے سلسلے میں جو اصول وضوابط پیش نظر رکھے گئے ہیں۔

1۔ ایسی اصطلاحوں کو ترجیح دی جائے جو مروج یا مقبول ہو چکی ہیں، خواہ ان میں کوئی معنوی یا لسانی سقم ہی کیوں نہ ہو۔

2۔ اگر کوئی اصطلاح ایک سے زیادہ معنوں میں مستعمل ہے تو اس کے مختلف مفاہیم کو علاحدہ الفاظ میں اصطلاح سے واضح کرنا چاہئے۔

3۔ اصطلاح اور عام لفظ میں فرق کیا جانا چاہئے۔ تمام الفاظ کو فرہنگ میں شامل نہیں کرنا چاہئے۔

4۔ ایک اصطلاح کا ایک ہی اردو متبادل دیا جائے بشرطیکہ وہ اصول نمبر دو میں نہ آتا ہو۔

5۔ جہاں تک ممکن ہو اصطلاح یک لفظی ہونی چاہئے۔ ناگزیر صورتوں میں یہ دو لفظی بھی ہو سکتی ہے مگر ایسی اصطلاحیں کم وضع کی جائیں۔

6۔ ہندی اصطلاحوں کو عربی اصطلاحوں پر ترجیح دی جائے اگر وہ با آسانی تلفظ اور تحریر کی جا سکیں۔

7۔ اگر کوئی اصطلاح ایک سے زیادہ علم یا فن میں مشترک ہے اور سبھی علوم میں ایک ہی مفہوم میں استعمال کی جاتی ہے تو اس کا اردو متبادل بھی ہر جگہ ایک ہی رکھا جائے گا۔

8۔ اصطلاح کو وضع کرنے کے اصولوں میں اتنی کشادگی ہونی چاہئے کہ ہندی، عربی، فارسی اور پراکرت تراکیب بھی قابل قبول ہوں۔

2.4 عمومی جائزہ

گوئٹے کا قول ہے کہ ''جملہ امور عالم میں جو سرگرمیاں سب سے زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت رکھتی ہیں ان میں ترجمہ بھی شامل ہے''۔ ترجمہ ایک ایسا پیچیدہ اور مشکل عمل ہے جس کے ذریعے کسی تصنیف کو اس کی جملہ خصوصیات کے

ساتھ اصل زبان سے کسی دوسری زبان میں کچھ اس طرح منتقل کیا جائے جس کے باوصف ترجمے کی زبان میں اصل تصنیف دوبارہ اپنی پرانی شکل میں زندہ جاوید ہو جائے۔

ترجمہ وہ دریچہ ہے جس سے دوسری قوموں کے احوال ہم پر کھلتے ہیں لیکن جدید عہد میں یہ ایک ضرورت بھی ہے، جس کے بغیر ہم عالمی سطح کی علمی ادبی سرگرمیوں میں شریک نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اپنی قومی زبان کی اہمیت کو برقرار رکھنے اسے گلوبل علم سے واقف کرانے اور جدید ٹکنالوجی کا ساتھ دینے کیلئے ترجمہ ایک بنیادی ضرورت ہے۔

ترجمہ ایک نہایت مشقت طلب کام ہے ایک فن ہے اور جملہ فنون کی طرح اس فن میں بھی کمال اور بے کمالی کے ہزاروں مدارج موجود ہیں۔ ترجمے کا ہنر اس لحاظ سے خاصا پیچیدہ ہے کہ اس میں دہری تہری صلاحیت کی ضرورت پڑتی ہے متن کی زبان اور اپنی زبان پر عبور حاصل ہونا چاہئے۔ موضوع سے بھی طبع مناسبت درکار ہے جو متن میں موجود ہے۔ مصنف سے بھی کوئی نہ کوئی نفسیاتی مماثلت لازمی ہے اور اس صنف ادب سے بھی لگاؤ ضروری ہے جس میں متن پیوست ہے۔ ترجمے کی دو بڑی قسمیں ہیں ایک تو مشینی ترجمہ ہے اور دوسرا تخلیقی ترجمہ۔ مشینی ترجمے کا مقصد ہے انسانی زبانوں میں باہمی ترجمے کے عمل کو کمپیوٹر کی مدد سے آسان بنانا، تاکہ تعلیمی، تکنیکی، معلوماتی اور تبلیغاتی مسالہ کم سے کم وقت میں تیار ہو سکے۔ اس کے برعکس تخلیقی ترجمہ تو ہوتا ہی ایسی تخلیقات کا ہے، جو تہہ در تہہ معنویت سے حاصل ہوں اور یہ ترجمے کی سب سے مشکل بلکہ تقریباً ناممکن قسم ہے۔ یہاں تک کہ تاریخ ادب میں متعدد تخلیقی فنکاروں نے اسے کلیتہً خارج از امکان قرار دے دیا ہے۔ اس کے باوجود شبلی کے تراجم سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جب کوئی شاعر کسی ایسے متن کو منتخب کرے جو اس کی طبیعت سے ہم آہنگ ہو تو فن ترجمہ کتنی بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے تخلیقی ترجمہ ایک ایسے اتفاقی حادثے کا نام ہے جس کی پیش بینی نہیں ہو سکتی۔

تھیوڈر ساوری نے ''آزاد اور لفظی ترجمہ'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا جسے آصفہ جمیل نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ تھیوڈر کا کہنا ہے کہ ترجمہ کرنے والوں کو ہمیشہ ترجمے کے فن کے بارے میں ہر ممکن معلومات حاصل کرنی چاہئے۔

مترجم کو یہ خیال رکھنا چاہئے کہ ہر فن میں تین طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ایک تو وہ جو آپ کو ہدایت دیتے ہیں اور دوسرے وہ جو آپ کی اصلاح کرتے ہیں اور تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو خود کو بہتر ثابت کرنے کے لئے بغیر کچھ جانے آپ پر تنقید یا نکتہ چینی کرتے ہیں۔ان تینوں میں سب سے اہم وہ لوگ ہیں جو آپ کو ہدایت دیتے ہیں کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے متعلقہ فن کے بارے میں ممکنہ معلومات حاصل کی ہیں اور ان کی دلیلوں کی بنیاد اصولوں اور نظریات پر ہوتی ہے۔

علمی ترجمے کے تحت تمام سائنسی علوم وفنون کی کتابیں آتی ہیں۔جن میں تاریخ، ریاضیات، معاشیات، قانون، طبیعیات، سیاسیات، انجینئرنگ اور میکانیات وغیرہ کی کتابیں شامل ہے علمی ترجمے عام طور سے لفظی ترجمے کی ذیل میں آتے ہیں۔علوم وفنون میں مخصوص اور متعین لفظیات اور اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں۔اس لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ کسی لفظ یا اصطلاح کا جو ترجمہ ایک جگہ کیا جائے ان کا انھیں معنوں میں ہر جگہ استعمال کیا جائے تا کہ ترجمے میں یکسانیت برقرار رہے اور قاری کا ذہن کہیں بھی الجھنے نہ پائے۔ان ترجموں میں سب سے بڑا مسئلہ اصطلاحوں کے ترجموں کا ہوتا ہے۔ان اصطلاحوں کو وضع کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ اصطلاحیں مسلمہ اصول کے مطابق وضع کی جائیں۔ تمام شرائط کے علاوہ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ علمی وفنی کتابوں کا ترجمہ متعلقہ علم وفن کا ماہر ہی انجام دے۔

لفظوں اور اصطلاحوں کے مناسب انتخاب کا مسئلہ سب سے بڑا ہے۔معاشرے کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔اس معاشرے کی اپنی ثقافت ہوتی ہے اس کے اقدار ہوتے ہیں۔علاقائی اور جغرافیائی تقاضے ہوتے ہیں۔ اور وہی تقاضے زبان وبیان اور لہجہ طے کرتے ہیں۔مترجم کو مذکورہ تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا چاہئے ۔اگر کوئی چیز یا معاشرے کا کوئی پہلو ایسا ہے جس کے ترجمے کے لئے ترجمے کی زبان میں لفظ یا اصطلاح موجود نہ ہو تو اسے جوں کا توں استعمال کر لینا چاہئے، اور حاشیے میں اس کی وضاحت کر دینی چاہئے۔

دوسرا اہم مسئلہ لفظ اور اصطلاح کے وضع کرنے کا ہے۔علمی متراجم کے دوران بالخصوص اصطلاحوں کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ تراجم کے دوران ایک مسئلہ یہ درپیش ہوتا ہے کہ کیسے دونوں زبانوں کا فقرے

اورمحاورے کی سطح تک جانکاری دستیاب ہو۔اوراگردونوں زبانوں کومذکورہ سطح تک مشک ہے یعنی تینوں کا ایک ہی شخصیت میں یکجاہونااشدضروری ہےورنہ اچھامترجم اوراچھاترجمہ منظرعام پرآنانہایت مشکل ہے۔

تراجم کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ مترادفات کاانتخاب اوراستعمال بھی ہے۔اکثرترجمے کی زبان میں ایسے مترادفات بہم نہیں ہوئے کہ اصل مفہوم کوپیش کیاجاسکے۔ترجمے کے دوران مترجم کودوزبانوں اوردوتہذیبوں کا سفر کرناپڑتاہےاوریہ اکاڈمک سفربہت دشوارطلب ہے کیونکہ کہ دونوں کے درمیان باریک فرق کوملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہی قدم بڑھاناپڑتاہے۔ترجمے کے دوران دوسرااہم مسئلہ طویل جملوں کا ہوتاہے۔اس مسئلے کوحل کرنے کے لئے موزوں طریقہ یہ ہوناچاہئے کہ ایسےطویل جملوں کوکئی مرتبہ پڑھنے کے بعدچھوٹے چھوٹے جملوں میں توڑدیناچاہئے۔ ترجمے کاایک بہت بڑامسئلہ یہ ہے کہ اگراپنی بات ہوتوآدمی جس طرح چاہےاس کااظہارکردےلیکن ترجمے میں آدمی بندھ کررہ جاتاہے۔مصنف کے ہاتھ میں مترجم کی باگ ڈورہوتی ہے۔اگراس نے گرفت سے نکلنے کی کوشش کی تواصل سے دورہوجاتاہےاوراگراس کے بالکل مطابق رہنے کی کوشش کی توبیان میں اجنبیت آجاتی ہے۔ایسے میں مترجم کی ذمہ داری یہ ہے کہ تصنیف کی زبان کوترجمے کی زبان میں ایک نئی اسلوب کے لئے راہ ہموارکرلے۔

سائنسی تراجم کےدوران سب سے بڑامسئلہ اصطلاحات کاہوتاہے۔سائنسی اصطلاحات کامسئلہ آسان نہیں۔ اس میں بڑی مشکلات آتی ہیں۔لہٰذاتوجہ اورسنجیدگی سے مسئلے کاحل تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔سائنسی علوم کواردو میں ڈھالنے میں درج ذیل مسائل درپیش ہیں۔

1۔ معیاری سائنس اصطلاحات کافقدان ہےاردو میں کوئی ایسی معیاری لغت یافرہنگ نہیں ہے جوہرطرح سےمکمل ہواورجسےمعیارماناجائے۔بعض اصطلاحات جولغات میں نظرآتی ہیں۔الفاظ کی روح سے مناسبت نہیں رکھتیں۔

2۔ سائنسی علوم کواردو میں ڈھالنے کاکوئی مربوط پروگرام نہ ہونے کےسبب دل جمعی سے کام کرناممکن نہیں۔جوکچھ ہورہاہےوہ غیرمنظّم طریقے سے ہورہاہے۔اسےمنصوبہ بندطریقے سے کرنے کی ضرورت ہے۔

3۔ ابھی تک یہ طے نہیں ہوسکا کہ انگریزی اصطلاحات کو ہر صورت میں ترجمہ کرنا ہے ویسے ہی استعمال کر لینا مناسب ہے۔

4۔ سائنس کی اپنی کوئی زبان نہیں۔ بعض اصطلاحات اتنی عام فہم ہیں کہ کسی بھی زبان میں ان کو ڈھالا جاسکتا ہے۔ مگر بعض کا ترجمہ قطعی مناسب نہیں۔ مگر بعض لوگ ہر لفظ کا ترجمہ چاہتے ہیں اور اس ترجمے کو رائج کرنا چاہتے ہیں۔ جس سے سائنس کی زبان اور اس کی لفظیات و اصطلاحات یکساں طور پر طے نہیں ہو پا رہی ہے جس سے سائنسی تراجم میں مشکلات آتی ہیں۔

5۔ سائنسی تراجم کے دوران حائل ان مشکلات کو حل کرنے کے لئے سائنسی برادری پر مشتمل کوئی اعلیٰ کمیٹی نہیں ہے جو کام کی نگرانی کرے اور کام کو آگے بڑھانے کے طریقے وضع کر لے۔

6۔ سائنس کے موضوع پر اردو میں لکھنے والوں اور سائنسی مواد کو ترجمہ کرنے والوں کا فقدان ہے اور یہ اس لئے ہے کہ انہیں معقول معاوضہ نہیں دیا جاتا اور اسی لئے اس میدان کی طرف زیادہ اہل علم رخ نہیں کرتے۔

ترجمے کی طرح ہم علم کو بھی بڑے پیمانے پر دو قسموں میں منقسم کر سکتے ہیں۔ سائنسی علوم اور سماجی علوم۔ دونوں کے ترجمے کا انحصار زیادہ تر اصطلاحات پر ہوتا ہے۔ سماجی علوم کے لئے اصطلاحات کے علاوہ دونوں زبان میں عام مہارت بھی ضروری ہوتی ہے۔ اس پہلو پر اس لئے زور دیا جاتا ہے کہ ان علوم کا ترجمہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک کہ مترجم تصنیف کی زبان کو اچھی طرح نہ سمجھتا ہو اور ترجمے کی زبان کے معنی خیز الفاظ کا وافر ذخیرہ اس کے ذہن میں محفوظ نہ ہو، سماجی علوم کا ترجمہ کرنے کے لئے اسے اپنی زبان میں بھی اظہار و بیان کی پوری قدرت حاصل ہونی چاہئے۔ اصطلاحات اور مشکل الفاظ کے لئے فرہنگوں، قاموسوں اور لغات کو بار بار دیکھنا تو بہر حال پڑے گا مگر مترجم کا خود اپنا ذخیرہ اتنا وسیع ہونا چاہئے کہ اس کام پر حد سے زیادہ وقت صرف نہ کرنا پڑے اور ایک معقول رفتار سے کام آگے بڑھے۔

ایک بہت بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ سماجی علوم کے لئے لسانی قابلیت، وسیع مطالعہ اور محنت تینوں چیزیں لازمی ہیں۔ جو بہت مشکل سے کسی مترجم میں یکجا ہوتی ہیں۔ فلسفے کے علاوہ دوسرے سماجی علوم میں بھی پس منظر کے طور پر ایک

قسم کا فلسفہ کارفرما ہوتا ہے۔تاریخ نفسیات، اخلاقیات، عمرانیات، معاشیات غرض جملہ انسانی علوم جو انسان کے ذہن اوراس کے اعمال سے تعلق رکھتے ہیں ان کے مسائل کا تجزیہ کسی نہ کسی قسم کے فلسفہ کا ضرور حامل ہوتا ہے۔ یہ تراجم عبارت کی مترادف عبارت ترجمے کی زبان میں پیش کرنے کے لئے ایک ایک لفظ کا مفہوم ادا کرنا ہوتا ہے۔تراجم بالعموم اورسماجی علوم کے تراجم، بالخصوص اس لئے بھی مشکل ہوتے ہیں کہ اردو میں کوئی بہت معیاری اور مبسوط لغت دستیاب نہیں ہے۔مولوی عبدالحق مرحوم کی لغت The standard English Urdu Dictionary اپنے آپ میں اچھی لغت ہے تاہم ناکافی ہے۔

2.5 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ ترجمے کے اصول پر مفصل بحث کیجئے۔

2۔ ترجمہ نگاری کے مسائل اُجاگر کیجئے

3۔ ترجمہ نگاری کے متعین کردہ اصولوں کے متعلق شخصیات کی آرائیں پیش کیجئے

2.6 امدادی کتب

۱۔اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، از اعجاز راہی ۲۔ترجمہ کا فن اور روایت، از قمر رئیس

۳۔اردو لسانیات، از نصیر احمد خان

اکائی نمبر3: ترجمے کے تقاضے اور مترجم کی خصوصیات

ساخت:

3.1 تمہید

3.2 مقاصد

3.3 ترجمے کے تقاضے اور مترجم کے خصوصیات

3.4 عمومی جائزہ

3.5 سوالات

3.6 امدادی کتب

3.1 تمہید

ترجمہ ایک مکمل عمل ہے۔اس عمل میں شاعری کے ترجمے کے مسائل ایک نثری شہ پارے کے مقابلے میں بالکل الگ ہوتے ہیں۔کسی علم کے ترجمے کے وقت ایک بڑا مسئلہ اصطلاحوں کا ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ مزید پریشانیوں کا باعث بنتا ہے اگر ہم ایسی دو زبانوں کو لیکر ترجمہ کر رہے ہوں جن کے ترجمے ومشاہدے الگ ہیں۔ثقافتی زندگیاں مختلف ہیں۔جغرافیائی حالات اور سماجی عمل کے درمیان فرق ہے۔ان تمام دشواریوں کے باوجود ترجمے ہو رہے ہیں اور وہ معیاری بھی ہیں۔ کچھ تو اصل سے بھی بڑھ گئے ہیں۔اردو میں یہ روایت پرانی ہے۔علوم وفنون سے لے کر ادبی فن پاروں کے ترجموں کا سلسلہ ڈھائی تین سو برسوں پر محیط ہے۔ ہر موضوع پر ہر طرح کے ترجمے دیکھنے کو ملتے ہیں۔مختلف

علوم وفنون کی تقریباً سوالاکھ اصطلاحیں وضع ہوچکی ہیں۔ یہ کام متعدد سرکاری اورنیم سرکاری اداروں نے کیا ہے ۔ ترجموں کا یہ سلسلہ جاری ہے۔

3.2 مقاصد

اس اکائی میں ترجمے کے مسائل اورمترجم کے فرائض سے بحث کی گئی ہے۔ترجمے کے مسائل سے کس طرح نبرد آزما ہونا چاہئے ۔ترجمے کے وقت مترجم کے فرائض کیا ہیں؟ کسی ادبی فن پارے کا ترجمہ اوراس میں شاعری یا افسانوی اورغیرافسانوی نثر کا ترجمہ اور زبانوں کی لسانی ساخت جیسے مسائل پرخصوصی توجہ دے کر اسے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔اس اکائی میں اصطلاحوں سے پیدا ہونے والی دشواریوں پر بھی ایک نظر ڈالی گئی ہے۔

3.3 ترجمے کے تقاضے اورمترجم کے خصوصیات

ترجمہ کرتے وقت مختلف نوعیّتوں کے مسائل سامنے آتے ہیں۔ یہ اس بات پر منحصر ہے کہ ترجمے کا مواد کیا ہے۔اگرترجمہ ادبی شاہکاروں کا ہے تو ہمارے مسائل علمی یا تکنیکی مضامین کے ترجمے کے مقابلے میں بالکل مختلف ہوں گے۔اول الذکر میں اگر شاعری ہے تو مجموعی تاثر،خیال کی شدت،مرکزی خیال،تخیل کی پرواز،امیجری کی نوعیت،الفاظ کی نشست وبرخاست ،صوتی آہنگ ، بحروں کا تناسب،اسلوب اور ہیئت وغیرہ سبھی کو ساتھ لیکر چلنا پڑے گا۔نثر میں مرکزی خیال،مجموعی تاثر ، سیاق وسباق اوراصطلاحوں جیسی باتوں پر ہماری توجہ مرکوز ہوگی۔مرکزی خیال اورمجموعی تاثر کودونوں جگہ اہمیت حاصل ہے۔ان پر مترجم کی مضبوط گرفت ہونالازمی ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ترجمہ کی جانے اورترجمہ ہونے والی دونوں زبانوں پر مادری زبان کی طرح عبور حاصل ہو۔شاعری کے مقابلے میں نثر کا ترجمہ کرنا نسبتاً آسان ہے کیونکہ اس میں مرکزی خیال مجموعی تاثر کو پالینے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی۔شاعری میں ان

کیفیات، محسوسات اور کرب سے گزرنا پڑتا ہے جو شعری تخلیق کا باعث بنے ہیں۔ زبان بولنے والوں کے سماجی تہذیبی اور معاشرتی اقدار اور رویے مرکزی خیال کو پکڑنے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اس لئے مترجم کی اس سے واقفیت ضروری ہے۔ ترجمہ کرتے وقت ہر بات کو اس کے سیاق میں دیکھنا چاہئے۔ زبان کی ادبی روایت سے ناواقفیت بھی ترجمے کو مجروح کر دیتی ہے اس کے علاوہ زبان کے مزاج کو بھی ہمیں سمجھنا چاہئے۔ شاعری میں استعمال ہونے والے ان اشاروں، کنایوں، استعاروں اور علامتوں کی جانکاری بھی ضروی ہے جن میں خیال بن سنور کر سامنے آیا ہے۔ لسانی ساخت کے پیچ وخم پر بھی دسترس ہونی چاہئے۔

ترجمے میں اس وقت دقت پیش آتی ہے جب ترجمہ کی جانے والی زبان ان مشاہدات، تجربات، تخیل کی پرواز، خیالات، کیفیات اور احساسات کو پیش کرنے سے قاصر رہی ہے جو ترجمہ ہونے والی زبان میں نہیں ملتے۔ اس کمی کو زبان کے مزاج کے مطابق اختراعی عمل یا الفاظ مستعار لے کر پورا کیا جاتا ہے۔ ترجمے میں تیسری اہم چیز ''شدت'' ہے یعنی جس شکل میں فنکار نے اپنے خیالات پیش کئے ہیں تقریباً وہی بات ترجمے میں آنی چاہئے ورنہ ترجمہ ناقص ہوگا۔ اس کے لئے الفاظ کا صحیح انتخاب اور استعمال ضروری ہے اور یہاسی وقت ممکن ہے جب الفاظ کے معنی کو سیاق وسباق میں جکڑ دیا جائے۔ اس طرح ترجمے کے الفاظ کے معانی ومطالب اپنے استعمال سے ایسا ہی مفہوم ادا کریں گے جیسا کہ ترجمہ ہونے والی تحریر چاہتی ہے۔ تشبیہات واستعارات اور امیجری کا بھی مناسب ترجمہ ہونا چاہئے تا کہ تخلیق اپنی شدت کی تمام نزاکتوں اور لطافتوں کے ساتھ سامنے آجائے۔

ترجمہ میں الفاظ کا صحیح استعمال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو مرکزی خیال، مجموعی تاثر اور خیال کی شدت تینوں چیزیں متاثر ہوتی ہیں۔ ترجمے کے وقت سیاق وسباق کے مطابق الفاظ کا انتخاب کرنا زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ یہ واحد طریقہ ہے جو لفظ کے صحیح مفہوم ہم تک پہنچاتا ہے۔ انگریزی لفظ House کا اردو میں ترجمہ کرنا بہت آسان ہے یعنی گھر یا مکان، لیکن انگریزی میں یہ لفظ انفرادی طور پر یا دوسرے الفاظ کے ساتھ مل کر تحریر میں الگ معنی بھی دیتا ہے۔

اب یہ سیاق وسباق ہی بتائے گا کہ عبارت میں یہ لفظ کس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ انگریزی میں ''ہاؤس'' کے مختلف استعمال اور معنی کو ذیل میں دیکھئے۔

اسی طرح اردو میں رہنے کی جگہ کے لئے مختلف الفاظ استعمال ہوتے ہیں جن میں معنی کے بڑے لطیف فرق موجود ہیں جیسے گھر، مکان، جھونپڑی، کٹیا، محل، حویلی، رہائش گاہ، دولت کدہ وغیرہ۔ اب یہ سیاق وسباق سے ہی طے ہوگا کہ عبارت میں کہاں کونسا لفظ آئے گا کیونکہ ہر لفظ میں رہنے کی جگہ کے معنی عیاں ہیں۔

عام طور پر رسم ورواج، تیوہار اور مکانوں کے نام ترجمہ نہیں ہوتے۔ البتہ حاشیوں میں ان کی تشریح کردی جاتی ہے۔ یہ اسی صورت میں مناسب رہے گا جب دو زبانوں کے معاشروں میں بڑا فرق ہو۔ مثال کے طور پر عصمت چغتائی کے افسانے ''چوتھی کا جوڑا'' کا انگریزی میں ترجمہ کرتے وقت بڑی حکمت علمی سے کام لیا ہوگا۔

ترجمے میں ایک خاص پریشانی محاورات کے ساتھ درپیش آتی ہے۔ ہر زبان کے محاورے بولنے والوں کی روایات اور تہذیبی قدروں کے مطابق ہوتے ہیں اور وہ جو مفہوم ادا کرتے ہیں اس کے پیچھے پوری تاریخ ہوتی ہے۔ ہمیں محاورے کی جگہ محاورے کی جستجو کے بجائے اپنی ضرورت کے مطابق محاورے کے مفہوم کو الفاظ سے اور الفاظ کے معنی کو محاورے کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

کسی علمی یا تکنیکی مضمون کے ترجمے میں بنیادی مسئلہ اصطلاحوں کا ہوتا ہے۔ بعض اوقات اصطلاحوں کو ہم بے دریغ مستعار لے کر حاشیوں میں ان کی تشریح کردیتے ہیں۔ اگر اصطلاح زبان کے صوتی وصرفی مزاج کے مطابق ہے اور عبارت میں ثقالت کو نہیں بڑھنے دیتی تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن یہاں ایک مسئلہ یہ کھڑا ہوسکتا ہے کہ اپنی وقتی ضرورت کے تحت ہم جو اصطلاح اپنا لیتے ہیں اسی قبیل کے معنوں کے لئے جب مختلف اشتقاقی عمل رکھنے والی اصطلاحیں آئیں گی تو کیا انہیں بھی جوں کا توں مستعار لے لیا جائے گا۔ ظاہر ہے یہ ممکن نہیں ہے۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ پوری اصطلاح کے بجائے ہم اس کی ساق کو لے لیں اور مستعار لینے والی زبان کے مروج سابقے اور لاحقے ہی اس میں استعمال کریں۔

کسی ادب پارے کے ترجمے کے وقت متعلقہ زبانوں کی ادبیات پر مترجم کی گہری نظر ہونی چاہئے ۔جس مصنف یا شاعری کی تخلیق زیرنظر ہے اس کے دوسرے شاہکاروں سے بھی واقفیت ضروری ہے۔اس کے علاوہ دونوں زبانوں میں زبان اور بولی کے فرق کی جانکاری بھی ترجمے میں مفید ہوسکتی ہے۔کیونکہ نثری شہ پارے کے ترجمے کے دوران بہت ممکن ہے کہ مصنف نے اعلی سوسائٹی اور متوسط دیہاتی لوگوں کی زندگی کو اپنا موضوع بنایا ہواور اپنی تحریر میں جگہ جگہ سماج کے ان طبقوں سے مکالمے بلوائے ہوں۔مکالمے کے اس فرق کو زبان اور بولی کے فرق کو سمجھنے کے بعد ہی ترجمے میں صحیح طور پر پیش کیا جاسکتا ہے اور کرداروں کے مکالموں کے ساتھ انصاف کیا جاسکتا ہے۔

ترجمے میں جملہ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔اگر جملے کی ساخت کو پوری طرح ذہن میں نہ رکھا جائے تو مفہوم کی روح متاثر ہوتی ہے۔تحریر میں خیال کا تسلسل بھی ٹوٹ جاتا ہے۔اچھی نثر میں ہر پیراگراف کا آخری جملہ عام طور پر اس پیراگراف کا نچوڑ ہوتا ہے اس لئے مضمون کے ترجمے کے وقت بڑی ہوشیاری کی ضرورت ہے۔اگر موقعوں پر جہاں جملے کا مفہوم سمجھ میں نہ آرہا ہو، جملے کو چھوٹے چھوٹے بامعنی حصوں میں تقسیم کر کے عمل اور ان کی مطابقت کے لحاظ سے جملے کے معنی کو سمجھنا چاہئے ۔عمل اور مطابقت کو آوازوں سے لفظوں میں ،لفظوں سے فقروں میں اور فقروں سے کلموں یا نیم جملوں میں رکھنا کارآمد ہوسکتا ہے۔انگریزی یا کسی اور زبان سے ترجمے کے وقت کبھی کبھی ہمارا مختصر فارموں (Short forms) سے واسطہ پڑتا ہے۔اسکے بجائے کہ ہم اردو میں بھی اسی طرح کی فارموں کو وضع کریں،مناسب یہ ہوگا کہ پورے لفظ لکھے جائیں ورنہ ہمارا عمل ترجمے کے بجائے نقالی کے مترادف ہوگا۔البتہ ایسی کوئی فارم جو ہمارے لئے عام فہم ہے اسے جوں کا توں استعمال کر سکتے ہیں جیسے ٹی،وی،یا یو این وغیرہ۔

3.4 عمومی جائزہ

ہرنوعیت کے ترجمے کا اولین تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ مترجم کو زیر ترجمہ متن کی زبان جسے اصطلاحاً اصل زبان (Source Language) کہا جاتا ہے اور ترجمے کی زبان جو (Target Language) کہلاتی ہے دونوں میں مہارت حاصل ہو۔دونوں زبانوں کی قواعد،اس کے محاوروں اور ضرب الامثال،صنائع و بدائع اور تریخ وتہذیبی پس منظر سے

اچھی طرح واقف ہونا ضروری ہے۔

ترجمے کے تقاضوں میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ مترجم کو ترجمے کی زبان میں مہارت تام اور دستگاہ کامل ہونی چاہئے بلکہ اسے اصل زبان سے زیادہ ترجمے کی زبان پر قدرت وعبور ہونا چاہئے یہاں تک کہ اسے ترجمے کی زبان میں خود لکھنے کی پختہ مشق ہونی چاہئے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے کہ مترجم کو اپنی زبان میں محسوس کرنے اور سوچنے پر قدرت ہونی چاہئے۔

بہرحال ہمارے خیال سے مترجم کا بذات خود مصنف یا تخلیقی فن کار ہونا ترجمے کا اصل تقاضہ نہیں ہے۔ اصل تقاضہ یہ ہے کہ مترجم کو ترجمے کی زبان کی گہری آگہی ہو۔ اسے اپنی زبان کے الفاظ کے ماخذ اور سرچشموں کا علم ہو۔ ان کے لغوی اور اصطلاحی معنوں سے واقفیت ہو۔ روزمرہ محاورات اور ضرب الامثال کی اصلیت اور ان کے محل استعمال سے باخبر ہو اور سیاق وسباق کے اعتبار سے لفظ کے معنی میں ہونے والے بدلاؤ کا درک رکھتا ہو۔ اپنی زبان کے مختلف اسالیب سے واقفیت مترجم کے لئے کس طرح مددگار ثابت ہوسکتی ہے اس کی ایک اچھی مثال محمد حسن عسکری کا میلوؔ کے ناول ''موبؔی ڈک'' کا ترجمہ ہے۔ اصل ناول میں بے شمار اسالیب گھلے ملے ہیں۔ عسکری نے بھی اپنے ترجمے میں اردو کے اتنے اسالیب گھلا ملا دئے ہیں کہ ترجمہ اصل کے تاثر کی ہو بہو ترسیل کرتا ہے۔ یہ اس لئے ممکن ہوسکا کہ محمد حسن عسکری اردو کے مختلف نثری اسالیب سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔

دنیا میں علوم وفنون کی بے شمار قسمیں ہیں جیسے شعروادب، سائنس، سماجی علوم اور مذہب وقانون وغیرہ۔ ذیل میں کچھ اہم علوم کے ترجمے کے مخصوص تقاضوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ علمی تراجم میں تمام سائنسی اور عمرانی علوم جیسے تاریخ، جغرافیہ، سماجیات، معاشیات، حیوانیات، نباتیات، طبعیات، کیمیاء، انجینئرنگ اور دیگر ٹکنالوجی کے علوم شامل ہیں۔ علمی تراجم کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ غیر تخلیقی ہوں۔ ان میں معلومات کی ترسیل اور نفس مضمون کے ابلاغ اور صحت مفہوم کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ علمی تراجم میں اصل مسئلہ مواد کی منتقلی کا ہے اسلوب کا نہیں۔ اس لئے علمی تراجم میں اصل

تصنیف کے خیال اور مفہوم کا صحیح ادراک اور اس کی ٹھیک ٹھیک ترسیل ضروری ہے۔

ادبی تراجم کو وسیع پیمانے پر دو حصوں یعنی منثور اور منظوم ترجمے میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ منثور یعنی نثری تراجم میں مصنف کے خیال کے علاوہ جذبات، احساسات، کیفیات، تاثرات اور اسلوب وغیرہ سبھی لوازمات کو ترجمے میں منتقل کرنا پڑتا ہے۔ منظوم ترجمے کا تقاضہ یہ ہے کہ اصل متن کے مرکزی خیال کے ساتھ ساتھ اصل کے آہنگ، موسیقی، فضا۔ اور صوتی اثرات کی بھی ترسیل کرے۔

مذہبی کتب تقدس کی حامل ہوتی ہیں۔ ان میں لفظ قطعی اور مستقل اہمیت کا حامل ہوتا ہے اس لئے ان کے ترجمے میں لفظ یا ترکیب کے مطابق لفظ اور ترکیب کا ہونا ضروری ہے۔

قانونی تراجم میں خصوصی احتیاط اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ قانون کی زبان نہایت جامع اور محتاط ہوتی ہے۔ اس میں ایک لفظ کے ادھر ادھر ہونے سے مفہوم میں فرق آجاتا ہے۔ اس لئے قانونی تراجم کا بنیادی تقاضہ یہ ہے کہ وہ اصل کے وفادار رہیں۔ ان ترجموں کی زبان میں صحت اور قطعیت کا ہونا ضروری ہے۔ صحافتی تراجم کو سادہ اور عام فہم ہونا چاہئے۔ صحافتی تراجم میں طویل، پیچیدہ اور مرکب جملے نہ ہوں۔ ترجمے میں عام بول چال کی زبان استعمال کی جائے۔ جملے مختصر ہوں اور کفایت لفظی کے ساتھ ابلاغ و ترسیل کا فعل انجام دیتے ہوں۔

ترجمہ ایک صبر آزما اور دقت طلب کام ہے۔ اس میں مہارت اور کمال پیدا کرنے کیلئے مترجم کو کچھ خصوصیات کا حامل ہونا ضروری ہے۔ (Etiene Doltet ۱۵۰۹۔۱۵۴۶) نے لکھا ہے کہ مترجم کو چاہئے:۔

1۔ اصل معنی کو سمجھے۔
2۔ اصل زبان اور ترجمے کی زبان پر عبور رکھے۔
3۔ لفظی ترجمے سے گریز کرے۔
4۔ ترجمے میں با محاورہ زبان استعمال کرے۔
5۔ الفاظ کے انتخاب اور ترتیب میں احتیاط برتتے ہوئے جملوں میں مناسب آہنگ پیدا کرے۔

مترجم کو ترجمے کا ذوق وشوق بھی ہونا چاہئے۔ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب اسے ترجمے کے کام سے فطری

مناسبت ہولغات بالخصوص ذولسانی لغات مترجمیں کے لئے مطالعے کے اہم ترین وسیلے ہیں۔ مترجم کا مطالعہ وسیع اورمتنوع ہونا چاہئے ۔ترجمے میں ذخیرۂ الفاظ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ مترجم کا مطالعہ جس قدر وسیع اور ہمہ جہتی ہوگا اس کا ذخیرۂ الفاظ بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔مختلف علوم کی لفظیات واصطلاحات سے اسی قدر مالا مال ہوگا جس سے مترجم کوترجمے میں بڑی مدد ملے گی ۔مترجم کومحنت کش اورمتشکک مستقل مزاج ہونا چاہئے ۔مترجم کوعجلت اورجلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئے ۔ترجمہ اصل متن کوسمجھ کردوسروں کوسمجھانے کا نام ہے جوشخص کسی متن کوخود نہ سمجھتا ہووہ دوسروں کوکیا سمجھا سکتا ہے۔اس لئے مترجم پرلازم ہے کہ کسی تصنیف کا ترجمہ کرنے سے قبل اس علم کی ضروری کتب کا مطالعہ کرے تا کہ اس علم کے اہم مباحث اوردیگر مشمولات کوصاف اورواضح طور پر بیان کر سکے ۔مترجم کے خصوصیات کے سلسلے میں آخری لیکن نہایت اہمیت کی حامل بات یہ ہے کہ مترجم کوذہین اورفطین ہونا چاہئے ۔غبی اور بلیدآدمی ماہرمترجم تودرکنار سرے سے مترجم نہیں بن سکتا۔

3.5 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ ترجمہ نگاری کے تقاضوں پراپنی رائے قلم بند کیجئے۔

2۔ مترجم کی خصوصیات پرمفصل ٹوٹ لکھئے۔

3۔ ترجمہ نگاری کے تقاضوں اورمترجم کی خصوصیات کے متعلق ناقدین کی آرائیں پیش کیجئے۔

3.6 امدادی کتب

1۔ ارسطو سے ایلیٹ تک،ازجمیل جالبی

2۔ اردو میں ترجمے کی روایت،ازقمر رئیس

3۔ فن ترجمہ نگار،ازخلیق انجم

اکائی نمبر4: ترجمہ کا فن اور اس کی قسمیں

ساخت

4.1 تمہید

4.2 مقاصد

4.3 ترجمہ کا فن اور اس کی قسمیں

4.4 عمومی جائزہ

4.5 سوالات

4.6 امدادی کتب

4.1 تمہید

پچھلے صفحات میں آپ نے ترجمہ کی ابتداء اس کے آغاز وارتقاء اس کے عملی مراحل، اصول وضوابط، مترجم کے لئے مطلوبہ اوصاف کے بارے میں تفصیل سے آگہی حاصل کی، اگلے صفحات میں ترجمہ کے انواع واقسام پر روشنی ڈالی جائے گی۔ ترجمہ کا میدان بہت وسیع ہے، اس کے ذریعے نئے نئے امکانات اور اضافے تشکیل پاتے ہیں، اس میں فلسفے جیسی پیچیدہ بحثوں سے لے کر شعروادب جیسی نازک اور دلکش اصناف ادب کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔

اگر چہ پہلے پہل تو ترجمے کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی تھی اور اسے محدود اور ثانوی حیثیت سے جانا جاتا تھا، ابتداء میں ترجمے کی ضرورت محض دینی ابلاغ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے محسوس کی جاتی تھی مگر بتدریج سائنس

اورادب بھی اس کے حصار میں آنے لگے اور آہستہ آہستہ اسے اہمیت دی جانے لگی جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آج ترجمہ باقاعدہ فن کی صورت اختیار کر چکا ہے اور موضوعات اور نوعیت کے اعتبار سے ترجمہ کی متعدد اقسام وجود میں آ چکی ہیں۔

4.2 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلباء ترجمہ کی مختلف اور متعدد اقسام سے متعارف ہوں گے۔ ترجمہ کی مختلف قسموں کے درمیان پائے جانے والے باریک فرق سے واقف ہوں گے۔ موضوعات کے اعتبار سے ترجمہ کی مختلف قسموں کے لئے اختیار کئے جانے والے اسالیب سے روشناس ہوں گے۔

4.3 ترجمہ کا فن اور اس کی قسمیں

بعض نقادوں نے ترجمہ کو نگینہ جڑنے کا فن قرار دیا ہے جس میں کافی مہارت ریاضت درکار ہوتی ہے۔ ایک زبان کے معانی اور مطالب کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کیا جائے کہ اصل عبارت کی خوبی اور مطلب جوں کا توں باقی رہے اس کے لئے دونوں زبانوں پر عبور اور قدرت درکار ہے۔ ترجمہ وہ کنجی ہے جس کے ذریعہ علوم وفنون کے خزانے کھل جاتے ہیں۔

ترجمہ محض ایک زبان کے خیالات کو دوسری زبان میں پلٹ دینے کا نام نہیں بلکہ خیالات واحساسات کو ترتیب وتنظیم کے ساتھ منتقل کرنے کا نام ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ترجمے میں اصل کی ساری خوبیاں پوری طرح پیدا کرنا مشکل ہے۔ لیکن بہت سی خوبیاں سموئی جاسکتی ہیں۔ بے شک ترجمے کا فن ایک مشکل فن ہے۔ اس کے لئے ایک خاص صلاحیت، خاص ڈسپلن اور کچھ خاص اور مستند معلومات درکار ہوتی ہیں۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ کامیاب ترجمے کے لئے مترجم کو درج ذیل شرطیں پوری کرنی چاہئے۔

الف۔ مترجم کو دونوں زبانوں پر قدرت ہونی چاہئے۔ ہر زبان کی اپنی باریکیاں، خوبیاں اور نفاستیں ہوتی ہیں۔ ان کی پوری سمجھ ہونی چاہئے۔ یہی نہیں بلکہ ترجمہ کرتے وقت ایک زبان کی خوبیوں کی دوسری زبان میں منتقل کرنے کی صلاحیت بھی ضروری ہے۔

ب۔ مترجم کو اصل تخلیق/مقالے کی زبان اور ترجمے والی زبان کے محاروں اور کہاوتوں پر یکساں قدرت ہونی چاہئے۔

ج۔ مترجم اپنی مادری زبان کے تہذیبی پہلوؤں سے یقیناً واقف ہوتا ہے لیکن جس زبان میں ترجمہ کر رہا ہے اس کی تہذیبی فضا سے واقفیت ضروری ہے۔

د۔ اگر ترجمہ کسی غیر تخلیق تحریر یعنی علم وفن کی کسی تصنیف کا ہو رہا ہے تو اس کے لئے اس فن یا علم کی اصطلاحات کا علم بھی ضروری ہے اور یہ علم اصل زبان اور ترجمہ والی زبان دونوں کا ہونا چاہئے۔

کامیاب ترجمہ وہ ہے جو اصل کے مطابق ہو یا بڑی حد تک اصل سے ملتا جلتا ہو۔ کامیاب ترجمے میں تخلیقی پہلو بھی ہونا چاہئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مترجم اصل کی جگہ اس کے برابر کوئی نظم یا ناول لکھ دے بلکہ مترجم اصل فن پارے کو اپنی زبان میں دوبارہ جنم دیتا ہے اور وہ بھی اس طرح نہیں کہ پہلے وہ اصل فن پارے کو مار ڈالے اور پھر اس کو اپنی زبان میں دوبارہ زندہ کرے۔ خلاقانہ ترجمہ وہ ہے جو اصل فن پارے کی شخصیت کو منہدم نہیں کرتا اور ترجمہ والی زبان میں پہلے سے موجود ادب سے مختلف معلوم ہوتا ہے لیکن قابل قبول اور قابل فہم ہوتا ہے۔ مشہور نقاد محمد حسن عسکری نے فرانسیسی اور انگریزی زبانوں سے کئی عمدہ ترجمے کئے۔ ان کا خیال تھا کہ ترجمے میں ''ترجمہ پن'' کا ہونا کوئی عیب نہیں ترجمہ دراصل مترجم کو دوطرفہ جنگ میں مبتلا کرتا ہے یہ جنگ اس زبان سے بھی ہوتی ہے جس سے ترجمہ کیا جا رہا ہے اور اس زبان سے بھی جس میں ترجمہ ہو رہا ہے۔ بعض لوگوں نے ترجمہ کو تخلیق کا درجہ دیا تاہم یہ ایک لمبی بحث ہے سب سے اہم بات صرف یہ ہے کہ ترجمے کے عمل کو جاری رہنا چاہئے تا کہ ترجمے والی زبان اور اس زبان کے ادب اور اس کے بولنے والوں کو علوم کے سرمائے سے مالا مال کیا جا سکے۔

عام طور پر شاعری کا ترجمہ سب سے مشکل مانا جاتا ہے۔اس لئے کہ شاعری کی اصناف میں فن کی نازک خوبیاں بہت ہوتی ہیں،جن کے ترجمے میں دشواری پیش آتی ہے۔پھر یہ کہ اکثر زبانوں کی شاعری میں اصناف الگ الگ ہوتی ہیں۔ ان کے موضوعات اور فنی تقاضے بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ان کو ترجمے میں قائم رکھنا مشکل ہوتا ہے۔مثلاً اردو زبان میں غزل، مرثیہ اور ریختی جیسی اصناف ہیں۔انگریزی یا جرمن زبان میں ان کا وجود نہیں۔اس لئے ان زبانوں میں ان اصناف کا کامیاب ترجمہ کرنا بہت مشکل ہوگا۔اس مشکل پر قابو پانے کے لئے شاعری کے ترجمے میں بالعموم دو طریقے برتے جاتے ہیں۔

۱۔ شعری تخلیق کی ہر سطر کا لفظی ترجمہ کر کے اس کے مفہوم یا شاعر کے تجربے کی کیفیت کو ادا کرنا۔

۲۔ شعری تخلیق یا نظم کے مطالعے سے مترجم کے ذہن میں جو تاثر پیدا ہو،معنوی اور جمالیاتی شاعر کے جس تجربے کی ترسیل ہوا پنے الفاظ میں اس کی بار آفرینی کر کے یعنی اس نظم کے خیال یا تجربے کو دوبارہ اس طرح جنم دئے کہ وہ اپنے آپ میں ایک تخلیق کا درجہ اختیار کر لے۔ولیریؔ کے مطابق مترجم کی وفاداری اصل شاعر یا اس کی تخلیق سے نہیں بلکہ اس تاثر سے ہوگی جو وہ تخلیق مترجم کے اندر پیدا کرے گی۔

ترجمہ کی اقسام

دور حاضر میں فن ترجمہ نگاری نے غیر معمولی ترقی کی ہے،اس فن میں بے شمار نئے میدان متعارف ہوئے ہیں اور موضوعات اور نوعیت کے اعتبار سے ترجمہ کی متعدد اقسام وجود میں آچکی ہیں۔اس اکائی میں ہم ترجمہ کی مختلف اقسام پر ایک نظر ڈالیں گے اور ان کے درمیان پائے جانے والے باریک فرق سے واقف ہوں گے تاکہ دوران ترجمہ ان فرق کو ملحوظ رکھ سکیں، نیز ترجمہ کی ان مختلف اقسام کے لئے مطلوبہ اسلوب اور اوصاف سے متعارف ہوں گے۔

ماہرین فن نے ترجمہ کو دو بنیادی قسموں میں تقسیم کیا ہے جو حسب ذیل ہیں۔

1۔ زبانی ترجمہ 2۔ تحریری ترجمہ

زبانی ترجمہ:۔ زبانی ترجمہ یہ ہے کہ اصل زبان کے الفاظ کو مترجم فی البدیہ مطلوبہ زبان میں زبانی طور پر منتقل کرتا ہے، چاہے یہ الفاظ تقریری طور پر ادا کئے گئے ہوں یا تحریری طور پر متن کی شکل میں موجود ہوں۔ ماہرین فن کے مطابق یہ ترجمہ کی مشکل ترین شکل ہے جس میں مترجم کو کوئی وقفہ نہیں ملتا جس میں وہ اپنے ترجمہ کو مرتب کرے یا اس پر غور اور نظر ثانی کر سکے، کیوں کہ ترجمہ کی اس قسم میں تقریر کا ایک حصہ ختم ہوتے ہی یا کبھی دوران تقریر ہی مترجم کو ترجمہ کے لئے تیار رہنا پڑتا ہے البتہ ترجمہ کی اس قسم میں تحریری ترجمہ کی سی باریکی اور اسلوب کی پابندی کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ مترجم کو تقریر کے خلاصہ یا فحوائے کلام کو منتقل کر دینا کافی ہوتا ہے۔ زبانی ترجمہ کی بھی ذیلی کئی قسمیں ہیں:

تحریر کا زبانی ترجمہ:۔ ترجمہ کی اس قسم میں مترجم اصل زبان میں تحریر شدہ خطبہ یا کوئی لکھا ہوا متن دیکھ کر فوراً برجستہ اسے زبانی طور پر مطلوبہ زبان میں منتقل کر دیتا ہے، اس منتقل کرنے میں مترجم کو کوئی وقفہ نہیں ملتا جس میں وہ اپنے ترجمہ کو مرتب کرے یا اس پر غور اور نظر ثانی کر سکے بلکہ متن دیکھ کر وہ ترجمہ کرتا چلا جاتا ہے۔

مسلسل ترجمہ:۔ ترجمہ کی اس قسم میں دو الگ الگ زبانیں بولنے والے افراد کی دو جماعتوں کے درمیان مترجم کو ترجمہ کے فرائض انجام دینا پڑتا ہے، ترجمہ کی یہ شکل بین الاقوامی سمیناروں، کانفرنسوں یا علمی مجالس میں ملتی ہے، اس طریقہ کار میں پہلے ایک گروپ کا آدمی تقریر کرتا ہے یا رائے اور تجویز پیش کرتا ہے جسے مترجم دوسرے گروپ کی زبان میں منتقل کرتا ہے، اس پر دوسرا گروپ اپنی زبان میں تقریر کا جواب دیتا ہے یا اس رائے و تجویز پر تبصرہ کرتا ہے، اس تبصرہ یا جواب کو مترجم پھر پہلی زبان میں منتقل کرتا ہے۔

اس ترجمہ میں مترجم کو اپنی سماعت کو مکمل طور پر مقرر کی طرف مرکوز رکھنا پڑتا ہے، ایک ایک لفظ کے مفہوم کو، اس کے سیاق وسباق کو سمجھنا پڑتا ہے، پھر پوری حاضر دماغی کے ساتھ فوراً دوسری زبان میں پیش کرنا ہوتا ہے تاکہ اس زبان کے سامعین اس پر اپنا جواب دے سکیں، پھر یہ اسے پہلی زبان میں منتقل کرے گا۔ جس پر پہلا گروپ فوراً جائزہ لے گا کہ اس کی بات صحیح طور پر دوسری زبان کے سامعین تک پہنچی یا نہیں اور اس کا صحیح جواب ملا یا نہیں۔ اس طرح سے ترجمہ کی یہ

قسم غیر معمولی ذمہ دارانہ کردار ادا کرتی ہے کہ مترجم پوری ذمہ داری کے ساتھ ترجمہ کرے کیوں کہ اس موقع پر ذرا سی لغزش بھی مترجم کی سبکی کا باعث بن سکتی ہے کیوں کہ یہاں ترجمہ کے ساتھ ہی ساتھ دونوں زبانوں کے متکلمین اور سامعین کی جانب سے تنقیح بھی ہوتی جاتی ہے۔

متوازی ترجمہ:۔ ترجمہ کی اس قسم میں مقرر تقریر کرتا رہتا ہے اور مترجم متوازی طور پر فوراً حاضرین کی زبان میں اس تقریر کو منتقل کرتا رہتا ہے، ترجمہ کی یہ شکل بین الاقوامی سمیناروں یا اجتماعات میں پیش آتی ہے جہاں بیرونی مہمانوں کی تقریروں کا مقامی زبان میں ترجمہ کرنا ہوتا ہے، جس میں مقرر تقریر کرتا رہتا ہے اور مترجم کے ترجمہ کے لئے کوئی وقفہ نہیں دیتا اور مترجم متوازی طور پر فی البدیہ فوراً حاضرین کی زبان میں اس تقریر کو منتقل کرتا رہتا ہے۔

مسلسل ترجمہ اور متوازی ترجمہ کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ مسلسل ترجمہ میں گفتگو کرنے والا اپنی گفتگو کے دوران وقفہ دیتا ہے تا کہ مترجم ترجمہ کر سکے، جب کہ متوازی ترجمہ میں ایسا نہیں ہوتا، مسلسل ترجمہ میں مترجم مقرر کے ساتھ بیٹھا رہتا ہے، تقریر کے اہم نکات کو نوٹ کرتا ہے، پھر جملوں کو بعجلت ممکنہ ہی سہی لیکن مرتب کر کے حاضرین کی زبان میں منتقل کرتا ہے، اس کے برخلاف متوازی ترجمہ میں مترجم ساتھ میں نہیں بیٹھتا بلکہ وہ اپنی کیبن میں بیٹھا مقرر کی تقریر ہیڈ فون کی مدد سے سنتا ہے اور مائک کی مدد سے مطلوبہ زبان کے سامعین تک پہنچاتا ہے جسے وہ لوگ بھی ہیڈ فون کی مدد سے سنتے ہیں۔

زبانی ترجمہ کی مذکورہ بالا قسموں کے بعد اب ہم تحریری ترجمہ کا تعارف کراتے ہیں، اور موضوعات کے اعتبار سے اس کی متعدد قسموں کی تفصیلات بیان کرتے ہیں۔

تحریری ترجمہ

تحریری ترجمہ یہ ہے کہ متن کو مطلوبہ زبان میں تحریری طور پر منتقل کیا جائے، یہ ترجمہ بعض پہلوؤں سے آسان سمجھا جاتا ہے کیوں کہ اس میں ترجمہ نگار کو جملوں کی ساخت اور الفاظ کی بندش کے لئے وافر وقت مل جاتا ہے کہ وہ اپنے

تحریرشدہ ترجمہ کے مواد پر اچھی طرح غور اور نظر ثانی کر لے، اس میں حذف و اضافہ کر لے، الفاظ کے نوک پلک درست کر دے اور ترجمہ میں جس قدر ممکن ہو سکے حسن پیدا کرنے کی کوشش کرے لیکن ساتھ ہی ساتھ ترجمہ کی یہ قسم مشکل ترین بھی ہے کہ اس میں مترجم کو نہایت باریک بینی کے ساتھ متن کے اسلوب کی رعایت کرتے ہوئے الفاظ کو مطلوبہ زبان میں منتقل کرنا اور اسے ضبط تحریر میں لانا ہوتا ہے تاکہ مستقبل میں کوئی اس کے ترجمہ پر انگلی نہ اٹھا سکے اور قاری جب جب بھی اس کے ترجمہ کو پڑھے اس کے ترجمہ شدہ مواد کے بارے میں اچھا تاثر لے سکے۔

تحریری ترجمہ کی ذیلی اقسام:

تحریری ترجمہ کا تعارف جان لینے کے بعد ہم اس کی قسموں کے متعلق جانکاری حاصل کرتے ہیں موضوعات اور اسلوب کے اعتبار سے تحریری ترجمہ کی بھی کئی ذیلی اقسام ہیں۔

علمی ترجمہ:۔ علمی ترجمہ سے مراد مختلف فنی اور تکنیکی علوم کی کتابوں کا ترجمہ کرنا جن میں ان علوم کے متعلقہ مباحث اور ان علوم کی معلومات پائی جاتی ہیں، مثلاً ریاضی، طبیعات، کیمیا، حیاتیات، جغرافیہ، طب، وہندسہ اور اس طرح کے بے شمار دیگر علوم کی کتابوں کا ترجمہ۔ علمی ترجمہ ایک نازک عمل ہے جس کے لئے مترجم میں حسب ذیل صفات کا پایا جانا ضروری ہے۔

- ☆ دونوں زبانوں پر گہری نظر ہو
- ☆ جس علمی موضوع پر کتاب ہے اس موضوع پر بنیادی واقفیت ہو
- ☆ متعلقہ موضوع پر دونوں زبانوں کی فنی اصطلاحات پر دسترس حاصل ہو
- ☆ حسن تعبیر پر قدرت حاصل ہو

یہ بات فن ترجمہ نگاری کے ماہرین کے نزدیک مسلم ہے کہ علمی ترجمہ اگر ایسا شخص کر رہا ہو جو اس موضوع کا ماہر ہو، متعلقہ موضوع کی اصطلاحات سے واقف ہو تو پھر علمی ترجمہ کوئی زیادہ مشکل کام نہیں، مثلاً کوئی طبیب جو عربی اور اردو

دونوں زبانوں پر قدرت رکھتا ہو، طبی اصطلاحات سے واقف ہو تو وہ بآسانی فن طب کی کسی بھی کتاب کا ترجمہ کر سکتا ہے، بمقابلہ اس شخص کے جو فن طب سے نا آشنا ہو اور صرف عربی و اردو زبان پر عبور رکھتا ہو، کیونکہ فن سے واقفیت کی وجہ سے عام مترجم کے مقابلہ میں طبیب زیادہ واضح اور بے تکلف اسلوب میں مناسب اصطلاحات اور تعبیرات کے ذریعہ مفہوم کو ادا کر سکتا ہے۔

علمی کتابیں فنی اصطلاحات کے ساتھ ساتھ مختلف اشکال، تصاویر، نقشوں، جدولوں اور توضیحی اشاریوں پر مشتمل ہوتی ہیں جن کو ماہر فن ہی زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے اور زیادہ آسانی سے دوسری زبان میں منتقل کر سکتا ہے۔

ادبی ترجمہ:۔ ادبی ترجمہ سے مراد ادبی شہ پاروں مثلاً ناول، افسانہ، ڈرامہ، مضامین اور ان سب سے بڑھ کر اشعار وقصائد اور دیگر اصناف سخن کا ترجمہ کرنا ہے ادبی تراجم ان کتابوں یا ادب پاروں کے ہوتے ہیں جن کے لکھنے والے زبان وادب کے فنکار مانے جاتے ہیں۔

ادبی ترجمہ ترجمہ نگاری کی ایک مشکل ترین قسم ہے جس میں الفاظ کے ساتھ ساتھ متن کی روح اور کیفیات، ادیب کے احساسات اور جذبات کو بھی مطلوبہ زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے تاکہ قاری پر وہی اثر مرتب ہو سکے جو اصل متن پڑھنے کے بعد ہوتا ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا یقیناً آسان نہیں ہے کیونکہ ہر زبان کی اپنی ضرورت اور خصوصیات ہوتی ہیں۔ ہر زبان کے محاورے، استعارے، مزاج، تراکیب اور طرز ادا مختلف ہوتا ہے، ہر زبان کا اپنا پس منظر اور حسن وآہنگ ہوتا ہے، اسی طرح ہر زبان کا طرز ادا مختلف ہوتا ہے، ہر زبان کے الفاظ میں وسعت اور تنگی کی مشکلات بھی پائی جاتی ہیں، کبھی کبھی کسی زبان کے الفاظ میں وسعت اور گہرائی اس قدر ہوتی ہے کہ دوسری زبان میں اس کا متبادل ڈھونڈنا ناممکن ہو جاتا ہے، جس سے مفہوم میں وہ تاثیر پیدا ہی نہیں ہوتی۔ پھر ایک اور مشکل اس وقت آتی ہے جب ایک زبان کے محاورے اور ضرب الامثال کا ترجمہ کرنا پڑتا ہے، کیونکہ ہر زبان اور ماحول کے اپنے محاورے اور ضرب الامثال ہوتے ہیں۔

بہترین ترجمہ وہ ہے جس میں متن کے ساتھ ساتھ دوسری زبان کا اصل متبادل بھی پیش کیا گیا ہو۔ ترجمہ اصل متن کے لب و لہجے کی ترجمانی کر رہا ہو اس میں متن کے مفہوم کے ساتھ اس کا ذائقہ بھی منتقل ہو جائے۔ کسی بھی بہترین ادبی نمونے کا ترجمہ کرنا یقیناً انتہائی مشکل کام ہوتا ہے۔ کسی بڑے شاعر کے کلام کا نثر میں ترجمہ اس سے بھی مشکل کام ہے۔

ادبی تراجم میں نہایت احتیاط اور پابندی ضروری ہوتی ہے تا کہ کہیں حقیقی فنکار کی تخلیقی روح مسخ نہ ہو جائے۔ ظ۔ انصاری اپنے مضمون ''ترجمے کے بنیادی مسائل'' میں کہتے ہیں:

> ''ادبی ترجمے میں مترجم پر مصنف کے خیالات کی پابندی فرض ہوتی ہے۔
> اس کے الفاظ و محاورات اور اس کے اسلوب بیان کی تقلید فرض نہیں ہوتی۔
> کیوں کہ تصرف کے بغیر ترجمے میں کام نہیں چل سکتا، اور اس بات میں جس
> قدر آزادی سے کام لیا جائے نگا ترجمہ اسی قدر تصنیف سے قریب ہوگا۔''

لہٰذا ادبی ترجمہ میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ کلام یا عبارت کی اصل روح کو مسخ کئے بغیر ناگزیر تصرفات کر کے تراجم کئے جائیں۔ ادبی ترجمہ اپنی ساخت کے اعتبار سے بنیادی طور پر دو خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1۔ نثر 2۔ نظم

ادبی نثر کے ترجمہ کے دوران مترجم کو حسب ذیل باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

☆ ادبی عبارت کا ترجمہ ادبی عبارت کے ذریعہ ہی ہو، اس طور پر کہ اصل متن کی پوری تصویر اس میں واضح ہو، کسی پہلو میں جھول ورنہ ہو۔

☆ ادب پارہ کا ترجمہ اس طرح کیا جائے کہ گویا مترجم خود اس کا تخلیق کار ہو۔

☆ ادبی ترجمہ میں صرف زبان دانی کافی نہیں بلکہ مترجم میں ادبی ذوق اور ادب کی چاشنی پائی جائے۔

☆ جب تک مترجم اہل زبان کی سی واقفیت نہ رکھتا ہو، اس وقت تک کسی زبان کے ادب پارہ کا ترجمہ اس کے لئے

درست نہیں۔

☆ مترجم کو چاہئے کہ زبان کے ساتھ ساتھ اہل زبان کی تہذیب وثقافت اور مزاج سے بھی واقفیت رکھتا ہو۔

مذکورہ بالا امور میں سے کوئی ایک پہلو بھی اگر چھوٹ جائے تو یہ نہ صرف متن کی روح کو مجروح کرے گا بلکہ صاحب متن اور خود کے ساتھ بھی زیادتی شمار ہوگا۔

نظم وشعر: جہاں تک شاعری کا تعلق ہے یہ ترجمے میں سب سے مشکل قسم کہی جاسکتی ہے۔ یہاں کئی لغزشیں ہونے کے امکانات رہتے ہیں۔اس میں جتنی محنت ایک شاعر اپنے اشعار کے لئے کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ کاوشیں مترجم کو کرنی پڑتی ہیں۔ غالباً یہی وجہ یہ کہ جتنے اچھے ترجمے نثری شہ پاروں کے ہوئے ہیں، اتنے اچھے اور نہ تعداد میں ان سے زیادہ شعری ترجمے ہوسکے ہیں۔

شعری ترجمے میں اچھے شعر کے تمام لوازمات اور ان کے نازک مراحل سے مترجم کو گزرنا پڑتا ہے۔ وہ ایک اچھے شاعر سے زیادہ ذمہ داریاں نبھاتا ہے۔اسے شاعر کے دل ودماغ میں سفر کر کے ان کیفیات سے گزرنا پڑتا ہے جن کے تحت شعر کہا گیا ہے۔شاعر کے محسوسات کو گرفت میں لانے کے لئے مترجم کو ترجمے کی زبان کے سرمایۂ الفاظ کو کھنگالنا پڑتا ہے، صوتی آہنگ کے لئے الفاظ کی ایک ایک آواز کو ناپنا اور تولنا پڑتا ہے، غرض ایک لمبی تراش خراش، تلاش اور کاوش کے بعد روح کو صحیح قالب ملتا ہے۔

ایسے موقعوں پر ہیئت یا فارم کا صحیح فیصلہ کرنا بھی اہمیت رکھتا ہے۔عربی میں اور اردو میں غزل، نظم، رباعی، مثنوی، مرثیہ، قصیدہ وغیرہ مختلف اصناف سخن ہیں۔ان میں سے ہر ایک کی اپنی الگ الگ خصوصیات اور اپنا الگ الگ طرز بیان ہے۔ظاہر ہے کہ ہر ادب میں یہ اصناف رائج نہیں ہیں اس لئے ترجمے والی زبان میں مروج اصناف میں سے اپنے مقصد کے لئے کسی ایک کو اس طرح چننا چاہئے کہ وہ سارے تقاضے پورے کرے۔

شعری ترجمے میں مرکزی خیال کو گرفت میں لے کر اسے متعلق زبان میں ظاہر کر دینا ہی کافی نہیں ہے۔ہمیں

اس تاثر کو بھی پیش کرنا ہوگا جو اصل کو پڑھ کر قاری کے ذہن میں قائم ہوتا ہے۔

اس لئے بلاشبہ شاعری کا ترجمہ ایک کٹھن راستہ ہے جسے عبور کرنے کے لئے ترجمے کے اصولوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے، شاعری کے ترجمہ کرنے کا عمل بہت مشکل ہے جبکہ کسی نثر پارے کا ترجمہ بھی کچھ آسان نہیں ہوتا لیکن شاعری پیچیدگیوں کے کئی اسباب ہیں مثلاً۔

☆ شاعری میں شاعر الفاظ کو بارہا علامت، اشارے کنائے اور استعارتی معنوں میں استعمال کرتا ہے۔

☆ بسا اوقات الفاظ حقیقی معنوں میں کچھ اور مفہوم دیتے ہیں جبکہ مجازی معنوں میں ان کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔

☆ شاعری میں شاعر کا اپنا ایک خاص لہجہ (Tone) ہوتا ہے۔اسی طرح شاعری مخصوص موڈ سے تعلق رکھتی ہے۔

☆ ہر نظم کا ایک اندورنی آہنگ ہوتا ہے۔جس سے اُس کا صوتی تاثر بنتا ہے۔

ان تمام پہلوؤں کا خیال رکھنا ازضروری ہوتا ہے تاکہ شاعری کا ترجمہ S . L a n g u a g e ہے T.Language میں کامیابی کے ساتھ ہو سکے۔

ادبی ترجمہ بالخصوص شاعری کے ترجمے میں محض معنی کی تبدیلی یا ترسیل سے مشکلات پیدا ہوتی ہیں کیونکہ لفظ معنی کے ساتھ مخصوص ثقافتی تہذیبی فضا وابستہ ہوتی ہے۔صحیح ترجمہ نہ ہونے کی صورت میں کسی لفظ کے حقیقی معنی کے گم ہونے کا خدشہ رہتا ہے۔لسانیاتی قواعد کی رو سے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے Source Language اور Target Language کے مابین ہم پلہ لفظ (Words Equivlent) کے طریقہ کار کو آزمایا جاتا ہے۔متبادل ہم پلہ لفظ نہ ملنے کی صورت میں مستعار لفظ (Borrow words) کا طریقہ اپنانا پڑتا ہے۔

علاوہ اس کے Source Language شاعری کے آہنگ کو دوسری زبان میں منتقل کرنا بھی کڑی آزمائش ہے ہرگز کم نہیں۔جبکہ شاعری میں تمثیل Images اور علامت، تلمیح، استعارے کو ہو بہو منتقل کرنا بھی جان لیوا کام ہے۔جس کے لئے کبھی کبھی مترجم کو شارح بننا پڑتا ہے حالانکہ ترجمہ اور تشریح دو الگ راستے ہیں۔

شاعری کا ترجمہ کرتے وقت ضروری ہے کہ مترجم کسی نظم کو جسے وہ ترجمہ کرنا چاہتا ہے اسے گہرائی سے بغور پڑھے اوراس عمل سے بار بار گزرے تا کہ شاعرانہ Images، شاعری کے آہنگ، اس کے صوتی تاثر، شاعری کے لہجے میں سرشار ہو جائے۔شاعری کی زبان سے آشنائی حاصل کرے تا کہ وہ شاعر کی زبان الفاظ کے حقیقی مفہوم تک پہنچ سکے۔

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا یقیناً آسان نہیں ہے۔ کیونکہ ہر زبان کی اپنی ضرورت اور خصوصیات ہوتی ہیں۔ ہر زبان کے محاورے، استعارے، مزاج، تراکیب اور طرز ادا مختلف ہوتے ہیں۔ ہر زبان کا اپنا پس منظر اور حسن و آہنگ ہوتا ہے۔اسی طرح ہر زبان کا طرز ادا مختلف ہوتا ہے۔ ہر زبان کے الفاظ میں وسعت اور تنگی کی مشکلات بھی پائی جاتی ہیں۔کبھی کبھی کسی زبان کے الفاظ میں وسعت اور گہرائی اس قدر ہوتی ہے کہ وہ دوسری زبان میں اس کا متبادل ڈھونڈنا ممکن ہو جاتا ہے جس سے مفہوم میں وہ تاثیر پیدا ہی نہیں ہوتی۔

پھر ایک اور مشکل اس وقت آتی ہے جب ایک زبان کے محاورے اور ضرب الامثال کا ترجمہ کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ہر زبان اور ماحول کے اپنے محاورے اور ضرب الامثال ہوتی ہیں۔مترجم اس وقت بھی مشکلات کا شکار ہوتا ہے جب وہ آزادی سے اپنی زبان کے محاسن کو دوسری زبان میں منتقل نہیں کر پاتا۔ وہ مصنف کی طرح آزاد نہیں ہوتا کہ اپنی فکر کے مطابق اسلوب الفاظ اور استعارے استعمال کرے۔

بہترین ترجمہ وہ ہے جس میں متن کے ساتھ ساتھ دوسری زبان کا اصل متبادل بھی پیش کیا گیا ہو۔اصل متن کے لب و لہجے کی ترجمانی کر رہا ہو اس میں متن کے مفہوم کے ساتھ اس کا ذائقہ بھی منتقل ہو جائے۔کسی بھی بہترین ادبی نمونے کا ترجمہ کرنا یقیناً انتہائی مشکل کام ہوتا ہے۔کسی بڑے شاعر کے کلام کا نثر میں ترجمہ اس سے بھی مشکل کام ہے۔

علمی اور ادبی ترجمہ میں فرق

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ علمی ترجمہ اور ادبی ترجمہ میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ علمی ترجمہ میں متن میں پائی جانے والی دقیق اصطلاحات اور فنی مباحث کو مطلوبہ زبان میں واضح عبارتوں میں غیر مبہم شکل میں منتقل کرنا مقصود

ہوتا ہے، جب کہ ادبی ترجمہ میں متن کی سی خوبصورتی اور استعارات وتشبیہات کے میعار اور الفاظ کے آہنگ کو برقرار رکھنا ہوتا ہے کہ ترجمہ میں بھی اصل متن کی سی تاثیر پیدا ہو سکے۔

قانونی ترجمہ:۔ قانوی ترجمہ سے مراد کسی بھی زبان میں پائی جانے والی قانونی دستاویزات، وثیقہ جات، عدالتی احکامات، قانونی معاہدات، حلف نامے اور عدالتی کاروائیوں کا ترجمہ ہے۔ اہل فن کے مطابق ترجمہ کی تمام اقسام میں یہ قسم سب سے زیادہ نازک مشکل سمجھی جاتی ہے اور زیادہ وقت طلب اور وسیع تجربہ چاہتی ہے۔

مترجم کے لئے لسانی مہارت کے ساتھ قانون متون کے ترجمہ میں دونوں نظام ہائے قانون S.L & T.L کی باریکیوں پر نظر ہونی چاہئے اور دونوں زبانوں کی قانونی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ ہونا چاہئے کیونکہ قانونی ترجمہ میں جو اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں وہ اس قانونی نظام کی عکاس ہوتی ہیں جن کا پورے نظام کو سمجھے بغیر صرف ڈکشنری کی مدد سے ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا کے کسی بھی قانون کی زبان میں بنیادی طور پر حسب ذیل خصوصیات مشترکہ طور پر پائی جاتی ہیں۔

☆ **باریکی اور گہرائی:** کسی بھی قانون کی زبان میں مستعمل الفاظ اپنے اندر بے پناہ گہرائی رکھتے ہیں اور مسئلہ کا بہت باریکی سے احاطہ کرتے ہیں۔

☆ **سادگی و بے تکلفی:** کسی بھی قانون کی زبان میں مستعمل الفاظ سادہ، بے تکلف اور مسجع ومقفی عبارتوں سے پاک ہوتے ہیں۔

☆ **وضوح:** کسی بھی قانون کی زبان میں مستعمل الفاظ اپنے مفہوم ومطلب کی ادائیگی میں نہایت واضح اور ہر طرح کے ابہام واشتباہ سے خالی ہوتے ہیں۔

قانونی ترجمہ میں مترجم کو حسب ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ قانونی مترجم کے لئے ضروری ہے کہ دوران ترجمہ ہمیشہ مروجہ مماثل اصطلاح کو تلاش کرے یعنی اصل زبان S.L کی کسی بھی قانونی اصطلاح کا مطلوبہ زبان

T.L میں رائج اصطلاح میں ترجمہ کرے کہ جس میں نہ تو لغوی طور پر کوئی ابہام ہو اور نہ ہی اصطلاحی طور پر کوئی اشتباہ ہو۔ مطلوبہ زبان میں مروجہ اصطلاح مل جانے کی صورت میں مترجم کو اپنی طرف سے اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں رہتی بلکہ اس قانونی اصطلاح کے ترجمہ میں اسی اصطلاح کو استعمال کرے۔

اگر مطلوبہ زبان میں مروجہ اصطلاح نہ مل سکے تو پھر مترجم کو چاہئے کہ حسب ذیل صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کرے۔ لفظی متبادل کا استعمال کرے اگر وہ صحیح مفہوم ادا کر رہا ہو۔

متن کا توضیحی ترجمہ کرے اور اصطلاح کو متن کی عبارت میں ہی قدرے وضاحت کے ساتھ بیان کر دے جس سے اس اصطلاح کا مطلب قاری کو سمجھ میں آ جائے۔ متن میں اس اصطلاح کو من وعن نقل کر دے اور حاشیہ میں اس کی تشریح کر دے۔ یا پھر اجتہاد سے کام لیتے ہوئے نئی اصطلاح ایجاد کرے۔ قانونی زبان بذات خود ایک اصطلاح ہے جس کا اطلاق مندرجہ ذیل اسالیب پر ہوتا ہے۔

قانون کی تدریس کی زبان:۔ یعنی وہ زبان جو قانون کی تدریس میں یا اس موضوع پر لکھے جانے والے مقالات، مباحثوں اور علمی مضامین میں استعمال ہوتی ہے۔

عدالتی زبان:۔ یعنی وہ زبان جو قانون سازی میں اور دستور کی تدوین میں استعمال ہوتی ہے نیز وہ ملکی و ریاستی قوانین جو پارلیمانی و مقنّنہ کی سطح پر منظور ہوتے ہیں اس میں استعمال کی جانے والی زبان، دستاویزات اور معاہدات کی مختلف دفعات اور شقوں کی ترتیب و تدوین میں استعمال کی جانے والی زبان بھی قانونی زبان کہلاتی ہے۔

مذہبی ترجمہ:۔ مذہبی ترجمہ سے مراد مذہبی کتابوں یا دینی عقائد و تعلیمات اور مذہبی عبارتوں کا ترجمہ ہے، ترجمہ کی یہ قسم بھی وقت طلب اور گہرائی کی حامل ہے جس میں نہایت اہتمام اور باریک بینی کے ساتھ سلیس اسلوب میں مذکورہ بالا موضوعات پر مشتمل مذہبی متون کو اصل زبان سے مطلوبہ زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ مذہبی ترجمہ نگاری میں لسانی مہارت کے ساتھ ساتھ اس مذہب اور مذہبی کتابوں پر عبور، اس مذہب کے دیگر تشریعی مصادر و مآخذ پر نظر، اس مذہب کی

مخصوص اصطلاحات کا گہرا علم ،اوران مذاہب کی ثقافت وتہذیب سے واقفیت ضروری ہے۔

چنانچہ اگر صرف زبان دانی اور جملوں کی نحوی وصرفی ساخت کی بنیاد پر مذہبی عبارتوں کا ترجمہ کیا جائے اور مذہب کے دیگر مستند مصادر کو دوران ترجمہ ملحوظ نہ رکھا جائے تو ایسا ترجمہ بسا اوقات مذہبی انتشار کا سبب بن جاتا ہے اور مثبت کے بجائے منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ مذہبی کتابوں کے ترجمے کرتے وقت یہ بات پیش نظر رکھی جائے کہ مذہبی صحیفوں یا قانون کی کتابوں میں قطعاً خود سے نہ تو کچھ بڑھایا جاسکتا ہے اور نہ ہی کمی کی جاسکتی ہے۔لہٰذا ایسی کتابوں کا لفظی ترجمہ ہی کیا جانا چاہئے۔

خودکار یا مشینی ترجمہ:۔ مشینی ترجمہ سے مراد وہ ترجمہ ہے جس میں یہ عمل کمپیوٹر کے ذریعہ انجام پاتا ہے،اس میں ترجمہ کے لئے بنایا گیا کمپیوٹر پروگرام ازخود متن کو پڑھتا ہے،اس کا تحلیل وتجزیہ کرتا ہے، جملوں کی نشست وبرخاست دیکھتا ہے اور پھر اس متن کو مطلوبہ زبان میں منتقل کرتا ہے یہ تمام عمل انسانی مدد کے بغیر خودکار طور پر کمپیوٹر کے سافٹ ویر کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔

مشینی ترجمہ دور جدید کی ایجاد ہے۔ دنیا کی تقریباً ہر بڑی زبان میں ترجمہ کرنے کے لئے سوفٹ ویئرز موجود ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ان سوفٹ ویئرز کے ذریعے کسی نہ کسی حد تک ترجمے میں مدد تو مل سکتی ہے مگر حقیقی طور پر ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ زبان اور اس کی باریکیاں، سیاق وسباق ،تعبیرات کی نزاکت ولطافت دو اور دو چار کی طرح کوئی حسابی فارمولہ نہیں ہے،اس طرح کے حسابی عمل میں کمپیوٹر کی مہارت اور سبک رفتاری تو واضح ہے لیکن ترجمہ کا عمل اس قبیل سے تعلق نہیں رکھتا کمپیوٹر کی ترجمہ کاری اس لئے بھی ناکام ثابت ہوئی ہے۔

شاعری سے قطع نظر عموماً نثری ترجمہ نگاری کے دوران بھی دو قسم کے مواد سے وابستہ پڑتا ہے۔ایک سادہ نثر اور دوسری نظریاتی ادبی تہذیبی اور تاریخ پس منظر رکھنے والا نثری سرمایہ۔ سادہ نثر جو بالکل ابتدائی ساخت کے جملوں پر مشتمل ہو،کمپیوٹر ان کا ترجمہ تو کرسکتا ہے یا ڈکشنری کی طرز پر مفردات کا متبادل لفظ تلاش کرسکتا ہے،لیکن ادبی تخلیقات کی

زبان میں معانی سادہ اور واضح نہیں ہوتے بلکہ وہاں بہت سے استعارات وکنایات اور بین السطور (Between The Lines) ہوتے ہیں جہاں تک کمپیوٹر کی رسائی نہیں ہوتی۔ایسے میں کمپیوٹر کی بے بسی واضح ہے۔

بہر حال ترجمہ کے لئے ایجاد ہونے والے ان سوفٹ ویئرز کا وجود اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ دنیا بھر میں ترجمے کی اہمیت اجاگر ہورہی ہے۔اج اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہمارے ہاں ایسے ماہر مترجمین تیار کئے جائیں جو بیک وقت اردو اور دیگر زبانوں کی وسیع تفہیم رکھتے ہوں۔اپنی اور دوسری زبان کے علمی،ادبی اور تہذیبی پس منظر سے واقف ہوں تا کہ دوران ترجمہ دونوں زبانوں کے پس منظر سے واقف رہ کر ترجمہ کاری کی نزاکتوں سے عہدہ برآ ہوں تا کہ ہم دیگر زبانوں میں ہونے والے علمی کام سے اپنے آپ کو ہم آہنگ رکھ سکیں۔

ترجمے کے اسالیب:۔ موضوعات کے اعتبار سے ترجمہ کی مختلف قسموں کو جاننے کے بعد یہاں اسلوب کے لحاظ سے ترجمے کی درج ذیل اقسام بیان کی جاتی ہیں:

1۔ لفظی ترجمہ 2۔ بامحاورہ ترجمہ

لفظی ترجمہ:۔ کسی عبارت یا تحریر کا لفظ بہ لفظ ترجمہ لفظی ترجمہ کہلاتا ہے اگر یہ بات کہ صحیح ترجمہ وہ ہے جو لفظ بہ لفظ کیا جائے اور خود سے اس میں کوئی کمی بیشی نہ کی جائے،مذہبی،فنی یا سائنسی کتابوں کے ترجمے کرتے ہوئے پیش نظر رکھی جائے تو یہ سو فیصد درست نظر آتی ہے۔مذہبی صحیفوں یا قانون کی کتابوں میں خود سے نہ تو کچھ بڑھایا جاسکتا ہے اور نہی کمی کی جاسکتی ہے لہٰذا ایسی کتابوں کا لفظی ترجمہ ہی کیا جانا چاہئے۔

بامحاورہ ترجمہ:۔ ایسا ترجمہ جو مصنف کی تحریر کے مفہوم کو رواں،عام فہم انداز میں،بلا تکلف روزمرہ کی زبان میں بیان کرے بامحاورہ ترجمہ کہلاتا ہے۔ادبی تراجم میں بامحاورہ ترجمہ کا استعمال عبارت کے حسن اور اس کے تاثر کو برقرار رکھنے میں معاون ہوتا ہے۔بامحاورہ ترجمے کے لئے نہ صرف دونوں زبانوں سے واقفیت ہونا لازمی ہے بلکہ اس کی تہذیب ومعاشرت ومحاورات اور ضرب الامثال سے آشنائی بھی ضروری ہے۔

بامحاورہ یا آزاد ترجمہ کرتے وقت مترجم کی طرف سے حذف واضافہ کا عمل نمایاں ہوتا ہے۔لہٰذا اس نوع کے تراجم کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری اصل فن پارہ کا محض ایک ہلکا سا تاثر ہی قبول کرسکتا ہے۔اس کے برخلاف لفظی ترجمہ کا فریضہ اگر احسن طریق سے انجام پا جائے تو ایسی صورت میں قارئین تک اصل تخلیق کی ترسیل کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

آزاد اور لفظی ترجمہ مغربی اصطلاح ہے، دونوں طریق کار کے مطابق اصل متن کو دوسری زبان (T.L) کے توسط سے قارئین تک اس خوشبو کو پہچانا ہے جو معنوی اور ظاہری صورت میں وحدت تاثر کو قابو میں رکھے۔اس طرح آزاد ترجمے میں تخلیقی اور جمالیاتی طرز عمل کو اپنایا جاتا ہے جبکہ لفظی ترجمہ میں مترجم اصل متن اور تخلیق کار سے وفاداری نبھاتا ہے۔

فن ترجمہ نگاری میں شاعری کے ترجمے میں بہت سی مشکلات درپیش ہوتی ہیں۔جنہیں آسان بنانے کے لئے آندرے لیفیور نے ساتھ مختلف قسم کے طریقوں سے حل بتایا ہے۔

1۔ صوتی ترجمہ Phonemic Translation

اس قسم کے ترجمہ میں Source Language کے صوتی تاثر کو Target Language میں از سر نو تخلیق (Reproduce) کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

2۔ ہو بہو لفظی ترجمہ Literal Translation اس حکمت علمی میں لفظ بہ لفظ ترجمے پر زور دیا جاتا ہے۔اگر چہ اس قسم سے ترجمے کی روح کو نقصان پہنچتا ہے۔

3۔ شاعری کا نثری ترجمہ Poetry into Prose

ترجمے کی اس قسم میں شعر کو نثر میں ڈھالا جاتا ہے، اس قسم میں ترجمے کا ابلاغ آسان ہو جاتا ہے۔

4۔ موزوں ردم کے ساتھ ترجمہ Rhymed Translation

ترجمے کی اس قسم میں مترجم کو ترجمہ علاوہ مزید دوسری پابندیاں اٹھانا پڑتی ہیں یعنی الفاظ کو منتقل کرنے کے ساتھ ساتھ آہنگ اور موسقیت/ بحور کا بھی خیال رکھا جائے۔اس طرح کے ترجمے میں اصل کا محض خاکہ بننا ممکن ہے۔

5۔ تشریحی ترجمہ Interpretation Translation

اس قسم کے ترجمہ میں S.L کا متن جوہر (Text) بحال رہتا ہے مگر ہیئت تبدیل ہو جاتی ہے کیونکہ مترجم نظم کی نقل تخلیق کرتا ہے جس میں نظم کا عنوان اور خیال اور اس کا اختتامیہ ایک سا ہوتا ہے۔

ترجمہ کی انواع واقسام کی بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اب جبکہ ترجمہ کو باقاعدہ فن کا درجہ حاصل ہو گیا ہے اور اس کی متعدد اقسام وجود میں آ چکی ہیں، نیز اس حوالے سے بہت سے اصول وضوابط اور نظریات بھی سامنے آ چکے ہیں۔ لہٰذا مترجمین کے لئے ضروری ہے کہ وہ وران ترجمہ ان اقسام کو ملحوظ رکھیں اور ان اقسام کے مطابق ان کے اصول وضوابط اور ترجمے کے علمی نظریات کو مدنظر رکھیں۔

4.4 عمومی جائزہ

ترجمے کا فن اس زمانے میں وجود میں آیا تھا جب دوسرے ملکوں اور قوموں کے حالات جاننے کی کوشش میں کسی ایک ملک کے لوگوں نے سیاح کے شوق میں ایک مقام سے دوسرے مقام تک کے سفر کا آغاز کیا تھا۔ جب یہ سیاح کسی دوسرے ملک میں پہنچتا تو اس ملک کی زبان خود سیکھتا یا کسی ایسے آدمی کا سہارا لیتا جو اس ملک کی زبان اور سیاح کی زبان دونوں سے واقف ہوتا۔

ترجمے کے فن کا محرک دوسرے ملکوں کے حالات اور ان کی علمی فتوحات کی تلاش تھی۔ جب بھی کوئی قوم علمی اور فنی دنیا میں قدم رکھتی تو عام طور سے اس کی پہلی منزل تلاش ہوتی یعنی وہ یہ جاننے کی کوشش کرتی کہ دوسری قوموں اور ملکوں نے علمی اور فنی میدانوں میں کیا کوشش کی۔ یہ ایک ایسی کھڑکی ہے جس سے جھانک کر ایک زبان کے لوگ دوسری زبان کے سماجی گروہوں یا قوموں کے حالات کی واقفیت حاصل کرتے رہے ہیں۔

انگریزی میں ترجمے کی فن پر تھیوڈر ساوری نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ جس کے مطابق ترجمے کے فن، اصولوں

اوراس کے طریق کار ذیل میں درج ہیں۔

1۔ ترجمے میں اصل متن کے الفاظ کا ترجمہ ہونا چاہئے۔

2۔ ترجمہ اصل متن کے معانی ومفاہم پر مشتمل ہو۔

3۔ ترجمہ بالکل اصل تصنیف کی طرح پڑھا جانا چاہئے۔

4۔ ترجمے میں اصل تصنیف کے اسلوب کی جھلک ہونی چاہئے۔

5۔ ترجمے کو ترجمے ہی کی طرح پڑھا جانا چاہئے۔

6۔ ترجمے میں اصل متن سے حذف واضافہ ممکن نہیں۔

7۔ نظم کا ترجمہ منظوم یا نثر میں ہوسکتا ہے۔

ترجمے کے تین اقسام کا ذکر کریں گے جن سے ترجمے کے دوران عموماً سابقہ پڑتا ہے۔

1۔ لفظی ترجمہ:۔ یہ ایک عام روایتی اور رسمی ترجمہ ہوتا ہے جس میں عبارت ومفہوم ومطالب کے گہرے احساس اور شعور کے بغیر لفظ بہ لفظ ترجمہ کردیا جاتا ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ ایک ناقص ترجمہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس سے ترجمے کا مقصد ادا نہیں ہوتا۔

2۔ بامحاورہ ترجمہ:۔ اس قسم کے ترجمے میں مترجم، ترجمے کے تقاضوں، اصول وضوابط مضمون کی گہرائی اور اسلوب کی صفائی کا خیال رکھتا ہے۔ اس میں زبان وبیان کے لسانی شعور واحساس کے دوش بدوش مضمون کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مضمون کا حق ادا کیا جاتا ہے۔ یہ ایک کامیاب ترجمہ کہلاتا ہے۔

3۔ آزاد ترجمہ:۔ یہ ترجمہ مضمون کے عین مطابق نہیں ہوتا بلکہ فکر وخیال کی کچھ آزادی کے ساتھ اظہار میں بھی آزادی برتی جاتی ہے ہوتا یہ ہے کہ ایک پیراگراف پڑھ لیا جاتا ہے اور اس کے مفہوم کو اپنے انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ خیال یہ رکھا جاتا ہے کہ پیش کردہ متن کے معانی ومفاہیم ادا ہوجائیں۔ ایسے ترجمے ادبی اعتبار سے عمدہ سمجھے جاتے ہیں۔

مختلف علوم وفنون کے تراجم کے دوران اصطلاحوں کے آجانے سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے، کیونکہ اصطلاح کا ترجمہ کوئی آسان مرحلہ نہیں ،مختلف علوم وفنون کی اصطلاحوں میں فرق ہوتا ہے۔مخصوص علم کے جس نوع کی اصطلاح درکار ہے ویسی اصطلاح تراشنا ایک صاحب علم، ماہرفن اور زبان پر قدرت رکھنے والی شخصیت ہی کا کام ہے۔وہ زبانیں جو موضوع کے مزاج اور اس کے سرشت سے لگاؤ نہیں کھا سکتیں ان سے مدد نہیں لی جا سکتی۔

4.5 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ ترجمہ نگاری کے فن پر مدلل بحث کیجئے

2۔ ترجمہ نگاری کی اقسام پر روشنی ڈالئے

3۔ ترجمہ نگاری کے ارتقاء پر اظہار خیال کیجئے

4.6 امدادی کتب

1۔ اردو میں ترجمے کی روایت۔قمر رئیس

2۔ فن ترجمہ نگاری۔،خلیق انجم

3۔ اردو میں ترجمے کی روایت۔مرزا حامد بیگ

اکائی نمبر 5: ترجمہ کی اہمیت وضرورت

ساخت

5.1 تمہید

5.2 مقاصد

5.3 ترجمہ کی اہمیت وضرورت

5.4 عمومی جائزہ

5.5 سوالات

5.6 امدادی کتب

5.1 تمہید

دنیا میں رہنے بسنے والے انسان جن وجود کی بنا پر ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔ان میں رنگ ونسل کے امتیاز، جغرافیائی بندشوں اور سیاسی تفرقوں سے بھی زیادہ بڑی وجہ زبان کا فرق ہے۔زبان یوں تو انسان اور انسان کے درمیان ارتباط کا اہم ترین ذریعہ ہے لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ زبانوں کا اختلاف اس ارتباط کے لئے سب سے بڑی روکاوٹ بن جاتی ہے۔اس روکاوٹ کو دور کرنے اور نوع انسان کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں ترجمہ بنیادی رول ادا کرتا آیا ہے۔اور ترجمے ہی کی بدولت آج دنیا گلوبل ولیج (Global Village) بن سکی ہے۔

ترجمہ بنیادی طور پر ایک زبان میں موجودہ علمی، مذہبی یا ادبی سرمائے کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا نام ہے۔اس سرمائے کی منتقلی دوصورتوں میں ممکن ہے۔ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم کس زبان کے اس نوع کے سرمائے کی

جانکاری مقررہ ضرورتوں یا مخصوص سماجی وثقافتی تقاضوں کے مطابق دوسری زبان میں پیش کریں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کسی زبان کے اس طرح کے سرمائے بعینہٖ دوسری زبان میں منتقل کیا جائے۔ پہلی صورت کو ہم محض استفادہ کہہ سکتے ہیں اگرچہ علم کے پھیلاؤ کے لئے یہ بھی ضروری ہے۔ تاہم اس میں بھی جگہ جگہ دو زبانوں کے باہمی فرق سے پیدا شدہ مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور منتقلی کی دوسری صورت سے ہی مدد لینا پڑتی ہے۔ دوسری صورت ترجمے کی ہے جس میں زبان میں موجو معنی ومطلب ہی نہیں بلکہ خود زبان کے اسالیب اور اظہار کے طریقہ کار اور بے شمار ایسی کیفیات بھی منتقل ہوتی ہیں جو زبان کے پس پردہ ہوتی ہیں۔ اس طرح ترجمہ ایک مشکل فن ہے جو اس لحاظ سے ناگزیر ہے کہ اسی کے طفیل علم وآگہی اور فکر وفن کی دولت انسانوں کی مشترکہ میراث بن جاتی ہے۔ اس کی بدولت ایک انسانی گروہ کے تجربات سے دوسرے انسانی گروہ فیض حاصل کر پاتے ہیں، عقیدے، علوم، افکار، منون، زندگی کے رویئے، تسخیر، فطرت کے خوابوں کی تعبیریں، سائنس اور ٹیکنالوجی میں انسان کی کامیابیاں اسی کے ذریعے سے ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتی رہی ہیں اور یوں علوم وفنون کے خزانے سب کے لئے کھلتے رہے ہیں۔

ترجمہ کی ضرورت عام طور چار وجوبات کی بنا پر پڑتی ہے اول مذہبی یا دینی اشاعت کی خاطر جس کے نتیجے میں قرآن پاک یا انجیل کا دنیا کی مختلف زبانوں میں بے شمار ترجمے ہوئے ہیں۔ دوم ترقی یافتہ ملکوں یا قوموں کے علوم وفنون سے واقفیت پانے یا دلانے کی غرض سے جس کی بدولت یہ علوم آج عالم انسان کی مشترکہ میراث بنے ہیں۔ سوم کسی زبان کے تحریری مواد میں اضافہ کرنے کے لئے جس کی بدولت وہ زبان اس قابل بن سکے کہ ہر طرح کے اظہار کے قابل بن جائے اور چہارم کسی نوع کی گھٹن کے ماحول میں تازہ ہواؤں کے دریچے وا کرنے کے لئے۔

اس لحاظ سے ترجمے کی تین موٹی قسمیں متعین کی جاسکتی ہیں۔ علمی ترجمہ، مذہبی کتابوں یا دینی نوعیت کے مواد کا ترجمہ اور ادبی ترجمہ، علمی ترجمہ کی ذیل میں تمام سائنسی علوم وفنون نیز سماجی علوم کی کتابیں یا تحریریں آتی ہیں۔ اس قسم کے ترجمے میں سب سے اہم مسئلہ اصطلاحات تلاش کرنے یا انہیں وضع کرنے کا ہوتا ہے۔ لیکن ایک آسانی یہ ہے کہ یہاں

ترجمہ سافیہا طبعی (Content) کا مقصود ہوتا ہے، علمی ترجمے میں متعلقہ علوم سے واقفیت لازمی ہے۔ مذہبی نوعیت کے تحریری مواد کے ترجمے میں عقیدے کی بہ نسبت محتاط رہنا اوّلین شرط ہے۔ ورنہ اچھے خاصے مسلمان پر حکم کنز بھی صادر ہوسکتا ہے۔ادبی ترجمہ بامحاورہ کے علاوہ زبان کی اظہار کے جمالیاتی کیف کو بھی منتقل کرنے کا نام ہے۔اس لئے سب سے بڑا مشکل فن ہے۔ کیونکہ یہ اس تخلیقی تجربے کا ترجمہ ہے جس کا وجود زبان سے باہر نہیں بلکہ زبان کی وجہ سے قائم ہوتا ہے۔

اسی طرح ترجمہ تین طرح سے ہوسکتا ہے ایک لفظی ترجمہ جس میں مترا جم اصل زبان کے قریب رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرا آزاد ترجمہ جس میں اصل زبان اور اس کے قریب سے آزادی برت کر اس میں موجو مواد کو دوسری زبان میں ڈھالنے کا من مانا طریقہ اپنایا جائے اور تیسرا تخلیقی ترجمہ جس کا دوسرا نام ادبی ترجمہ بھی ہے۔ یہ اس لحاظ سے مشکل ہے کہ اس میں مافیہا اور بہت کے باہم ارتباط سے پیدا شدہ وہ صورت منتقل کرنا پڑتی ہے۔ جو واضح اور آسانی سے گرفت میں آنے والی نہیں ہوتی۔اس لئے بعض لوگ اس طرح کے ترجمے کو باز تخلیقی یعنی (Recreation) بھی کہتے ہیں۔

ترجمہ وہی شخص کرسکتا ہے جو اصل زبان (Source Language) اور ہدفی زبان (Target Language) دونوں پر برابر قدرت رکھتا ہو۔ زبانوں کو جاننے کا مطالعہ بڑا پیچیدہ ہوتا ہے کسی زبان کے الفاظ اور اس کے قواعد کو جاننا ہی زبان دانی نہیں ہوتی۔ زبان کسی قوم یا خطے کی سماجی ثقافتی اور فکری کروٹوں کی بھی حاصل ہوتی ہے۔اس لئے اس قوم کی پوری تہذیب کا علم جب تک نہ ہو تب تک اس کی زبان پر قدرت رکھنے کا دعویٰ بے بنیاد ہے۔ ترجمہ کار دو زبانوں کے درمیان ایک پل کا کام دیتا ہے اس لئے اس پُل کے دونوں سرے الگ الگ کناروں پر مضبوط بنیادوں پر استوار ہونے چاہئیں۔

ترجمہ اصل متن کی مخصوص وضع کو منتقل کرنے کا نام ہے۔ اس اعتبار سے مترجم، مصنف یا تخلیق کار کا مطیع ہوتا ہے۔ یعنی اصل متن سے وفاداری اس راہ میں بنیادی شرط ہے لیکن یہ وفاداری آسانی سے نبھائی نہیں جاسکتی کیونکہ اس میں خوبصورتی سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا احتمال ہر وقت رہتا ہے۔ کانٹ نے اسی لئے کہا ہے کہ ترجمہ اس عورت کی طرح

ہے جو اگر خوبصورت ہے تو وفاداری نہیں اور اگر وفادار ہے تو بدصورت ہے (Faithless beauty or faith ugliness) تاہم مترجم کی یہ کوشش ہونی چاہئے کہ اعتدال کی راہ اختیار کرے۔ تخلیقی یا ادبی ترجموں میں اس بات کا خیال رکھنا لازمی ہے کہ الفاظ کے پس پردہ معنی کی کئی جہتیں ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ آہنگ، اسلوب، جملوں کی ساخت بذات خود جمالیاتی قدر رکھتی ہے۔ اس لئے کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ترجمے میں اصل تخلیق کی یہ ساری جمالیاتی اور معنوی کیفیت آجائیں۔ ہر چند ایک ناممکن امر ہے لیکن اس راہ میں یہی اصول مسافر کو منزل یاب کرسکتا ہے۔

ترجمہ کاری محض ایک فن ہی نہیں بلکہ ایک قومی خدمت بھی ہے۔ یہی وہ سرگرمی ہے جس کی بدولت کوئی بھی ترقی پذیر قوم ترقی یافتہ قوموں کے تجربوں سے آشنا ہوتی ہے اور ان سے فیض حاصل کرتی ہے۔ اس کی بدولت سقراط اور افلاطون جیسے حکماء کے افکار عربوں نے یونان کی تہذیبی کھنڈروں سے نکال کر مشرق و مغرب کے سامنے رکھے۔ اس کے ذریعے عربوں کے علوم و افکار مغربی دنیا تک پہنچے اور ترقی پا گئے۔ اسی کے طفیل چھوٹی اور جدید زبانیں وسعت پا گئیں اور ان میں لسانی تشکیل کا عمل جاری رہا۔ ترجمہ کا وجود نہ ہوتا تو دنیا گونگے بہروں کی دنیا ہوتی اور منارہ بابل کی طرح شاید نیست و نابود ہو چکی ہوتی۔

5.2 مقاصد

اس اکائی کا مقصد طلبا و طالبات کو ترجمہ کی اہمیت و ضرورت کے متعلق اہم اور نادر معلومات بہم پہنچانا ہے۔ دنیا ادب میں ترجمہ کی اہمیت کیا ہے؟ دیگر زبانوں کا ترجمہ اپنی زبان میں یا کسی اور زبان میں کیوں کیا جاتا ہے؟ کسی زبان کے ادب کو ہمارے لئے جاننا کیوں ضروی ہے اور ایسی کیا وجہ ہے کہ ترجمہ دن بدن اہمیت کا حامل ہوتا چلا جارہا ہے۔ ہمیں قدم قدم پر دیگر زبانوں کے ادب کو سمجھنے کے لئے ترجمہ کی ضرورت کیوں درپیش آتی ہے۔ ترجمہ کسی تہذیب، تمدن اور لسانی نظام کو سمجھنے میں کیوں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ترجمہ کے بغیر ہم کسی دوسری زبان کے ادب، تہذیب و تمدن

اورلسانی نظام کو کیوں اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب میں کیا لکھا جارہا ہے اور اس کا کیا معیار ہے۔ ان مذکورہ نکات کو ابھارنا ہی اس اکائی کے مقصد میں شامل ہے۔

5.3 ترجمہ کی اہمیت اور ضرورت

علم جب کتابوں کی صورت میں مرتب ہوجاتا ہے تو پھر وہ کسی ایک قوم یا ملک کی میراث نہیں رہ جاتا بلکہ دوسری قومیں اور دور دراز کے خطوں کے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس مشترکہ مراث سے مختلف زبانوں کے جاننے والے لوگ ترجمہ کے ذریعہ استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی لئے جب ہم دنیا کے مختلف ملکوں اور خطوں کی زبان وادب کی تاریخ پڑھتے ہیں تو اندزہ ہوتا ہے کہ تمام اہم زبانوں میں ترجمے کی روایت بہت قدیم ہے۔ یہ ترجمے کی روایت ہی ہے جس کے سبب قدیم دور میں عرب اور ہندوستان کی سائنس، طب، ریاضی، ادب اور فلسفے کی کتب کے تراجم یونانی اور لاطینی زبانوں میں ہوئے اور یورپی اقوام نے ان تراجم کی روشنی میں اپنی صلاحیتوں کو نکھارا اور ان علوم کو مزید آگے بڑھایا اور پھر یہ علوم یورپی قوموں کی مسلسل تحقیق وجستجو کے نتیجے میں پوری دنیا کے سامنے آئے۔ سقراط اور افلاطون جیسے مفکرین کے خیالات ترجمہ کے ذریعہ ہی پوری دنیا سے متعارف ہوئے۔ اسی طرح بوعلی سینا، ابن رشد اور ابونصر فارابی کے کارناموں کو عربی سے لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ اسی طرح بعد کے زمانے میں والٹیئر نے شیکسپیئر کا ترجمہ فرانسیسی میں کیا اور پاسترناک نے روسی زبان میں اہم ادبی شاہکاروں کے تراجم کر کے اپنی زبان کی بیش بہا خدمت کی۔ یوں تو ہم دیکھتے ہیں کہ تمام انسانی علوم کے ارتقا اور فروغ میں تراجم کی اہمیت مستقل اور مسلم ہے۔

تراجم کو دو خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے حصے میں وہ تراجم آتے ہیں جو اردو زبان کے ارتقاء کے ابتدائی دور میں سامنے آئے۔ ان میں مذہبی کتب، تمثیلیں، داستانیں، تاریخیں اور شاعری کے آزاد تراجم شامل ہیں یا پھر وہ ماخوذ کتب جنہیں کسی تخلیق کے نفس مضمون کو لے کر اردو میں اسی صنف ادب یا پھر کسی دوسری صنف میں منتقل کر دیا گیا۔

شعری تخلیقات کا ترجمہ حالانکہ بہت ہی مشکل کام سمجھا جاتا ہے پھر بھی اردو میں شعری تخلیقات کے کم ترجمے نہیں ملتے ہیں۔ بیشتر ترجمے عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی زبانوں سے ہوئے ہیں۔ عربی زبان کے بیشتر شعری سرمائے کا ترجمہ مدرسوں سے وابستہ لوگوں نے کیا ہے۔ فارسی زبان سے دیوان حافظ کا ترجمہ کوثر چاند پوری نے کیا اور شرح اشرف علی تھانوی نے لکھی ہے۔ سنسکرت کے بھی کئی شاعروں کی تخلیقات کے تراجم اردو میں ہوئے ہیں۔

مترجم کو دو زبانوں اور دو قوموں کے درمیان لسانی اور ثقافتی سفیر کا نام دیا جاتا ہے۔ وہ دو قوموں اور تہذیبوں کے درمیان رابطے کا کام کرتا ہے اور انہیں ایک دوسرے کے قریب لاتا ہے۔ اس اہم ذمے داری کے حامل شخص کے لئے لازم ہے کہ وہ ترجمے کی بنیادی شرطوں سے واقف ہو تبھی وہ اپنا کام ایمانداری سے انجام دے سکے گا۔ پہلی شرط تو یہ ہے کہ وہ اصل تصنیف کی زبان، اس کے ادب اور قومی تہذیب سے اچھی طرح واقف ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ اس زبان پر بھی مکمل قدرت رکھتا ہو جس میں وہ ترجمہ کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ وہ نئے یا اجنبی تہذیب کے خیالات کے اظہار کے لئے مناسب الفاظ منتخب کر سکے اور ضرورت پڑنے پر نئے الفاظ، نئی اصطلاحیں اور تراکیب وضع کر سکے۔ ترجم کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنی حدود سے تجاوز نہ کرے۔ یعنی اس کا کام اصل تصنیف کے ترجمے تک محدود رہے، تشریح و توضیح، تحریف و تخفیف اور حذف و اضافہ کرنا اس کا کام نہیں۔ ڈاکٹر جانسن نے لکھا تھا کہ ترجمے کو اصل سے بہتر بنانے کی کوشش کسی بھی طرح اچھی بات نہیں ہے، اسے قابل تحریف نہیں کہا جا سکتا۔ مترجم کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ تصنیف کی فنی اور معنوی اہمیت کے پیش نظر اسے ترجمے کی زبان میں پوری ایمانداری سے منتقل کرنے کی کوشش کرے۔

ترجمے کا بنیادی مقصد علم کی ترسیل ہے۔ یہ علم کس قسم کا ہے، اس کی بنیاد پر ترجمے کے کئی مقاصد گنائے جا سکتے ہیں۔ پروفیسر محمد حسن اپنے مضمون ''ترجمہ: نوعیت اور مقصد'' میں لکھتے ہیں کہ بنیادی طور پر ترجمے کے تین مقاصد ممکن ہیں پہلا معلوماتی دوسرا تہذیبی اور تیسرا جمالیاتی۔

معلوماتی مقصد کے ضمن میں سائنسی، بشری یا سماجی علوم کی کتب کے تراجم آجاتے ہیں۔ ان تراجم کی کامیابی

اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ کتاب میں فراہم کردہ معلومات کو کتنی کامیابی کے ساتھ بغیر کسی غلطی کے صاف اور سادہ زبان میں اس طرح منتقل کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو اسے سمجھنے میں کسی طرح کی الجھن کا شکار نہ ہونا پڑے۔

ترجمے کی دوسری ضرورت تہذیبی ہے یعنی کسی معاشرے اور اس کی تہذیب کو سمجھنے کے لئے لوگ اس سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بھی ترجمے کا سہارا لیا جاتا ہے۔اس ضمن میں افسانوی ادب اور ناولوں کا ترجمہ آتا ہے۔اس کے علاوہ سماجی اور تہذیبی علوم سے متعلق ایسی کتابوں کے ترجمے کو بھی اسی دائرے میں رکھا جاسکتا ہے جن میں مختلف تہذیبوں اور تہذیبی مظاہر کا تفصیلی مطالعہ یا مشاہدہ کیا گیا ہو۔

ترجمے کا تیسرا مقصد جمالیاتی احساس کی تسکین یا جمالیاتی انبساط ہے۔یعنی انسان کے احساس جمال کی تسکین کے لئے فنون کی تفہیم ہونی چاہئے ظاہر ہے کہ فنون لطیفہ میں صرف شاعری ایسی چیز ہے جس کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

5.4 عمومی جائزہ

قوموں کی ترقی میں ترجمے بہت اہم رول ادا کرتے ہیں۔یہی وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعے دوسری زبانوں میں موجود علوم وفنون تک ایک ایسے شخص کی رسائی بھی ممکن ہوجاتی ہے جو اپنی مادری زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں جانتا۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ترجمہ کیوں کیا جاتا ہے۔کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی شخص کو کوئی خاص زبان نہیں آتی اور وہ چاہتا ہے کہ اس زبان میں موجود مواد سے استفادہ کرے۔مجبوراً وہ کسی ایسے شخص سے ربط پیدا کرتا ہے، جو اس زبان سے واقف ہے ادبی تخلیقات کا معاملہ یہ ہے کہ ان میں زبان کی نزاکتیں بھی ہوسکتی ہیں۔علامتیں، محاروے، روزمرہ، استعارے اور کنائے بھی ہوسکتے ہیں اور چونکہ ہر زبان کی اپنی کچھ منفرد خصوصیات ہوتی ہیں اس لئے اکثر وبیشتر دشواری پیش آتی ہے۔لیکن اگر مترجم اصل زبان اور ترجمے کی زبان سے بخوبی واقف ہو تو وہ دشواریوں پر قابو پاسکتا ہے۔پھر بھی

اصل زبان کا حسن ترجمے کی زبان میں قدرے ماند پڑسکتا ہے اگر اصل مواد علمی نوعیت کا ہے تو یہاں صرف مفہوم سے غرض ہوتی ہے تا کہ پڑھنے والا اصل متن ہی کی طرح ترجمہ شدہ متن سے استفادہ کر سکے۔ اسی لئے علمی ترجمے کا سب سے عام اور اہم اصول یہ ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرتے وقت اصل مفہوم کا ترجمہ مقصود ہونا چاہئے۔ ادبی تخلیقات میں یہ مسئلہ بھی ہوتا ہے کہ استعمال کئے گئے لفظ کے مفہوم کی کئی سطحیں ہوسکتی ہیں لیکن علمی مضامین میں ادبیات کی طرح اظہار کی پیچیدگی نہیں ہوتی۔

ادب انسان و کائنات کے درمیان رشتوں کا محسوساتی اور اکتشافی اظہار اور انسانی جبلتوں وخواہشوں اور ان کے وجدان کا مظہر ہوتا ہے۔ اعلیٰ ادب کے لئے یہ لازمی شرط ہے کہ اس میں انسانی زندگی اور کائنات کا گہرا مطالعہ ومشاہدہ ہو اس میں زندگی اور اس کے مظاہر کی معنویت اور مقصدیت شامل ہو۔ اس لئے بعض ماہرین کا خیال ہے کہ دنیا میں اعلیٰ ادب کے ابتدائی نمونے مذہبی اور الہامی کتابوں کی صورت میں ملتے ہیں کسی تہذیب میں تصور انسان اور تصور کائنات بڑی حد تک ان الہامی کتب سے ہی قائم ہوتا ہے۔ ادبی ترجمے کی معنویت اور اہمیت وافادیت کی دو جہتیں ہوتی ہیں۔

1 معنی جہت یعنی خیال وتصور کی سطح پر۔ 2 لفظی جہت یعنی زبان اور اسلوب کی سطح پر۔

1۔ معنی جہت:۔ اس جہت کے تحت ایک قوم دوسری قوم کے خیالات، نظریات، تخیلی نیرنگیوں اور جمالیاتی واخلاقی قدروں سے استفادہ کرتی ہے۔ یا باہم دگر دو قومیں سچائیوں اور صداقتوں کی توثیق کر کے یکجہتی و یگانگت کو مستحکم کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے ادبی ترجمہ تہذیبی نشو ونما کا باعث ہوتا ہے۔

2۔ لفظی جہت:۔ اس جہت کے تحت ایک زبان دوسری زبان کے ادب سے وسعت و گہرائی اور فکری بلندی کی خصوصیات حاصل کرتی ہے اور ایک زبان دوسری زبان کی ذیلی ساخت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ نئے خیالات اور نئے احساسات کو بیان کرنے کے لئے زبان میں نئے اسلوب پیدا ہوتے ہیں، زبان میں نئے نئے الفاظ شامل ہوتے ہیں

یاان سے آشنائی ہوتی ہے جس کے نتیجے میں ایک زبان میں استحکام اورخواعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ایک ترقی یافتہ زبان کے معنی یہ ہے کہ اس میں ہرقسم کے خیالات وتصورات کو بیان کرنے کی صلاحیت ہو۔ادبی ترجمے کے وسیلے سے زبان کوترقی حاصل ہوتی ہے۔

5.5 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ ترجمے کی اہمیت پراپنے خیالات کااظہار کیجئے۔

2۔ ترجمے کی ضرورت پر بحث کیجئے۔

3۔ اردو میں ادبی ترجموں پراپنی رائے قلم بند کیجئے۔

5.6 امدادی کتب

1۔ ترجمے کافن اورروایت،ازقمر رئیس

2۔ فن ترجمہ نگاری،از پروفیسر ظہورالدین

3۔ فن ترجمہ نگاری،ازمرتبہ خلیق انجم

4۔ ترجمے کافن (نظری مباحث)،ازمرزا حامد بیگ

اکائی نمبر6: ترجمہ کاری میں فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، دارالترجمہ عثمانیہ اور دیگر اداروں کی خدمات

ساخت

6.1 تمہید

6.2 مقاصد

6.3 ترجمہ کاری میں فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج.....

6.4 عمومی جائزہ

6.5 سوالات

6.6 امدادی کتب

6.1 تمہید

کسی زبان میں محفوظ طبعی وسماجی علوم وفنون، شعروادب کے ذخیرے جب کسی دوسری زبان میں بذریعہ تحریر منتقل کئے جاتے ہیں تو ہم انہیں ترجمہ کہتے ہیں اور بذریعہ تقریر ہو تو ترجمانی کہیں گے۔ ترجمے کے وسیلے سے علوم وفنون اور زبان وادب کی بتدریج ترقی ہوتی ہے۔ ابتدائی دور کے سپاٹ ترجموں کے بعد ان میں پختگی اور کمال پیدا ہوتا گیا جس میں بڑا دخل اصطلاحات کا ہے۔ ترجمے کے دوران اصطلاحات کے ہمہ جہت استعمال نے ترسیل وابلاغ میں معنویت اختصار اور حسن اظہار پیدا کر دیا ہے۔ ہمارے یہاں اردو میں ترجمے اور صطلاحات وضع کرنے کی روایت صدیوں پرانی ہے۔ یہ ترجمے لاطینی، عربی، فارسی، سنسکرت، یونانی، فرانسیسی اور بہت بعد میں انگریزی سے اردو میں ہوتے رہے۔ تراجم کی یہ ابتدائی کوشش انفرادی یا شخصی تھیں۔ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے آغاز ہی سے ترجموں کے لئے باضابطہ اداروں، مدرسوں اور انجمنوں کی جانب سے کوشش کی جانے لگیں۔ مدرسہ غازی الدین (۱۷۹۲)، فورٹ

ولیم کالج (۱۸۰۰)، دہلی کالج (۱۸۲۵)، درالترجمہ شمس الامراء حیدرآباد (۱۸۲۵)، محکمہ علوم وفنون حیدرآباد دکن اوردرالترجمہ جامعہ عثمانیہ (۱۹۱۷)، نے مختلف علوم کے کے ترجموں اوراصطلاحوں کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ تراجم کے دوران اوراصطلاح سازی کا بڑا صبر آزما اور نازک مرحلہ آتا ہے۔ جس کی طرف بیسویں صدی میں خصوصی توجہ کی گئی۔ پروفیسر وحیدالدین سلیم کووضع اصطلاحات سے ہی نہیں بلکہ نئے نئے الفاظ بنانے سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ پروفیسر وحیدالدین سلیم شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے اولین صدر تھے۔ مولوی عبدالحق محکمۂ دارالترجمہ، جامعہ عثمانیہ کے ناظم اورانجمن ترقی اردو کے معتمد تھے۔ انہیں کی تحریک پروحیدالدین سلیم نے اپنی گراں قدر تصنیف ''وضع اصطلاحات'' طبع کرکے دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ سے شائع کی۔ برکت علی چودھری نے ''طریق تسمیہ'' تصنیف کی۔ فن ترجمہ نگاری اوراصطلاحات سازی کے موضوع پراردو میں کئی اور کتابیں، مضامین اوررسائل بھی منظرعام پرآتے لگے جن سے ترجمےاورترجمے سے متعلق موضوعات پرکام کرنے کے لئے سہولتیں پیدا ہوئیں۔

6.2 مقاصد

اس اکائی کا مقصد ترجمہ نگاری کے فروغ میں فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، دارالترجمہ عثمانیہ اور دیگر اداروں کی خدمات کواُجاگر کرکے طلباء وطالبات کوان سے روشناس کروانا ہے۔ ہندوستان کے علمی وادبی اداروں نے کن کن کتب اورکن کن زبانوں کے ادب کا ترجمہ کیا۔ ان سب کا ذکراس اکائی میں شامل ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے زیرتحت کن کتب کا ترجمہ ہوااورکس نوعیت کا ترجمہ ہوا۔ کس ترجمے کوشہرت نصیب ہوئی۔ دہلی کالج میں کس طرح کی کتب کا ترجمہ کیا گیا اوران کا معیار کیا رہا۔ کس مترجم نے اعلیٰ پائے کا ترجمہ کیا۔ دارالترجمہ عثمانیہ میں ترجمے کے ارتقاء میں کیا رول ادا کیا اس کے علاوہ دیگر چھوٹے چھوٹے اداروں کی ترجمے کی روایت کوفروغ بخشنے میں کیا کردار ادا کیا۔ ان سب باتوں کا ذکر تفصیل سے اس اکائی میں پیش کیا گیا ہے۔ ان مذکورہ ادبی وعلمی اداروں کی ترجمہ کے متعلق خدمات کو بروئے کار لانا اس اکائی کا اہم مقصد ہے۔

6.3 ترجمہ کاری میں فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج.....

ترجمہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ایک زبان سے دوسری زبان میں بیان کرنے کے ہیں۔ یہ بیان اس وقت فن کی صورت اختیار کر لیتا ہے جب مترجم مصنف کی فکر کو جذب کر کے اس کے متن کے فنی لوازم کو برقرار رکھتے ہوئے اِسے ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرتا ہے۔

ترجمہ بڑا مشکل کام ہے۔ یہ نگینہ جڑے کا فن ہے جو بڑی مہارت اور ریاضت چاہتا ہے۔ ایک زبان کے معنی ومطالب کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنا کہ اصل عبارت کی خوبی اور اس کا مطلب جوں کا توں باقی رہے ترجمہ کہلاتا ہے۔ اس طرح جہاں تک ترجمہ کی تعریف کا تعلق ہے اسے ہم ان الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں کہ ترجمہ کسی زبان پر کئے گئے ایسے عمل کا نام ہے جس میں کسی اور زبان کے تین کی جگہ دوسری زبان کا متبادل متن پیش کیا جائے۔ اس تعریف میں معانی، مفہوم، مطلب انداز بیان اور اظہار بیان واسلوب کے تمام پہلو آجاتے ہیں۔ مترجم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس فن کے اصولوں سے واقفیت رکھتا ہو۔ دو زبانوں کی واقفیت رکھتا ہو، ایک وہ جس میں ترجمہ کیا جارہا ہو اور دوسری وہ جس سے ترجمہ کیا جارہا ہو۔ ان دونوں زبانوں کے مزاج، تہذیب، تمدن، کلچر وغیرہ سے ازبس واقفیت ہونی لازمی ہے تب جا کے ترجمہ کامیاب ہوسکتا ہے۔ سیرو نے لکھا ہے۔

> ''ترجم کا کام لفظ کی جگہ لفظ رکھنا نہیں بلکہ مصنف کے اسلوب اور زبان کی طاقت کو اپنی زبان میں محفوظ کرنا ہے۔''

موپاساں، ملار ہے جیسے ادیب شعراء اور نقاد ان ہی ترجموں کی بدولت اردو ادب میں زیادہ سے زیادہ متعارف ہوئے ارسطو کی بوطیقا کے کم از کم تین ترجمے اب تک اردو میں مشہور ہیں۔ شاعری میں حالؔی سے لے کر اقبالؔ، فراقؔ، راشدؔ اور میراجیؔ تک مختلف شاعروں نے مغربی ادبیات سے استفادہ کرنے اور مختلف رویوں اور رجحانات کو اردو میں متعارف کرنے کے لئے ترجموں کا بڑا ذخیرہ اردو زبان کو دیا۔

ترجمے کا کام ہر وقت جاری رہتا ہے اور موجودہ دور میں اس کی ضرورت زیادہ ہے کیونکہ علم وآگہی کا اس قدر تیزی سے پھیلاؤ تاریخ نے شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔ سائنسی اور ٹیکنالوجی میں ہونے والی حیرت انگیز پیش رفت سے اگر ترقی پذیر ممالک فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو اس کا سب سے بہتر ذریعہ ترجمہ ہے اردو میں ترجمہ نگاری کا کام اس لحاظ سے زیادہ لازمی ہے کہ اس کی بدولت یہ زبان نئے چیلنجوں کا سامنا کرسکتی ہے اس سلسلے میں انفرادی کاوشوں سے زیادہ اداروں کی جانب سے منظّم کوشش زیادہ بارآور ثابت ہوسکتی ہیں۔

فورٹ ولیم کالج 1800 سے پہلے جو ترجمے ہوئے۔ وہ سب انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھے۔ فورٹ ولیم کالج پہلا ادارہ تھا جس نے منظّم اور باقاعدہ طریقے پر عربی، فارسی اور سنسکرت سے اردو میں ترجمہ کئے۔ فورٹ ولیم کالج کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ انگریزوں کو مقامی زبان سے آگاہ کرنا تاکہ وہ آسانی سے حکومت کرسکیں۔ اس لئے تراجم کا سلسلہ شروع ہوا، کالج میں ہندوستانی (اردو) کا ایک شعبہ گل کرسٹ کی صدارت میں قائم کیا گیا۔ جس کے لئے نصابی کتابیں تیار کی گئیں۔ جن میں تصانیف بھی تالیف بھی اور تراجم بھی شامل تھیں۔ تراجم میں پابند ترجمے بھی تھے اور آزاد ترجمے بھی۔ پابند ترجمہ اسے کہا جاتا ہے جس میں اصل زبان کے پورے مفہوم کو دوسری زبان میں منتقل کیا جائے۔ فورٹ ولیم کالج کے تراجم میں میر امن کی ''باغ و بہار'' اور ''گنج خوبی'' کی ''طوطا کہانی''، اور ''گل مغفرت''، نہال چند لاہوری کی ''مذہب عشق''، شیر علی افسوس کی ''باغ اردو'' اور ''آرائش محفل''۔ مظہر علی خان کے ''ماھونل''، ''کام کنڈالا'' اور ''تاریخ شیر شاہی'' کاظم علی جوان کا ''شکنتلا ناٹک'' اور ترجمہ قرآن، مرزا علی لطف کی ''گلشن ہند'' وغیرہ جیسے تراجم رواں دواں اور اہمیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ جن لوگوں نے فورٹ ولیم کالج میں اردو میں ترجمے کئے۔ ان میں بہادر علی حسینی، مظہر علی خان دالا، میر ابوالقاسم، طوطا رام وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

فورٹ ولیم کالج کے بعد اردو ترجمے کی تاریخ میں دوسرا اہم ادارہ دلی کالج 1825ء تھا۔ جہاں درنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم کی گئی۔ جہاں ہندوستانیوں کو مغربی تعلیم دینے کے لئے بڑے پیمانے پر ترجمے کئے گئے۔

جبکہ فورٹ ولیم کالج میں انگریزوں کو ہندستانی تعلیم دینے کیلئے ترجمے کئے گئے۔اس لحاظ سے دہلی کالج کو فورٹ ولیم کالج پر فوقیت حاصل ہے۔ یہاں آزاد ترجمے کو ترجیح دی گئی اور فورٹ ولیم کالج کی طرح یہاں بھی ادبی ترجمے کم ہی ہوئے۔ دہلی کالج کے چند معروف ادبی تراجم میں امام بخش صہبائی کا ترجمہ ''حدائق البلاغت'، ماسٹر پیارے لال کا ترجمہ ''دربار قیصری'' اوران کے علاوہ شکنتلا، بدرمنیر وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں۔

ترجمے کی روایت میں سرسید کی تحریک کو بھی دخل ہے لیکن سیاسی اختلافات کے سبب ادبی تراجم کے اعلیٰ نمونے نہیں پیش کرسکی۔ یہاں عنایت دہلوی کے تراجم اہمیت کے حامل ہیں۔انہوں نے انگریزی کی دقیق کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔مثلاً ڈیواین کا سٹیڈی ''سلامبو، ٹائنس، جنگل بک وغیرہ۔

1865ء میں انجمن پنجاب لاہور اور روہیل کھنڈ ایک لٹریری سوسائٹی کے قیام سے بھی ترجمہ کی روایت کو فروغ ملا۔1903ء میں انجمن ترقی اردو کے قیام سے ترجمے کی روایت کو ایک نئی جہت ملی۔ یہاں ادبی ترجمے کے ساتھ ساتھ وضع اصطلاحات پر زیادہ توجہ صرف کی گئی۔ تاریخ ادبیات ایران، خطبات گارساں وتاسی، تاریخ عہد انگلشیہ، مشاہیر یونان وروم وغیرہ اس انجمن کے یادگار تراجم ہیں۔

اردو میں ترجمہ کی روایت کو منظر عام پر لانے میں جامعہ عثمانیہ کا خاصا اہم رول رہا ہے اس کا قیام 1917ء میں عمل میں آیا۔ یہاں دارالترجمہ عثمانیہ قائم کیا گیا۔اس ادارے سے تقریباً 400 کتابیں انگریزی فارسی، عربی، جرمنی اور فرانسیسی سے ترجمہ کی گئی ہیں۔

1936ء کے بعد اردو ادب میں ادبی اور تنقیدی تراجم میں اضافہ ہوا۔عزیز احمد نے ارسطو کی بوطیقا کا ترجمہ ''فن شاعری'' کے نام سے کیا۔جو 1941ء میں شائع ہوا۔1968ء میں محمد ہادی حسن نے ''مغربی شعریات''، شمس الرحمٰن فاروقی نے 1978ء میں ''شعریات'' جمیل جالبی نے 1976ء میں ''ارسطو سے ایلیٹ تک'' اور 1978 میں ''ایلیٹ کے مضامین'' جیسے تراجم لکھے اور شائع کئے۔

بیسویں صدی کے اردو اب میں پریم چنداور سجاد حیدر یلدرم سے لے کر اختر حسین رائے پوری، سعادت حسن منٹو، عزیز احمد، محمد حسن عسکری، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین نے نثری اب کا ترجمہ کیا ہے اور اقبال سے لیکر فیضؔ، راشدؔ، فراقؔ، میراں جی، مجید امجدؔ وغیرہ جیسے شاعروں نے شعری ادب کے ترجمے کئے ہیں۔ مغرب کے تخلیقی ادب کے تراجم سے اردو اب میں وسعت پیدا ہوگئی۔ تراجم کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور ترجمہ بطور فن اپنی جڑیں مضبوط کر چکا ہے۔ ان تمام اداروں کے علاوہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ہنوستانی اکیڈمی الٰہ آباد ترقی اردو بورڈ دہلی، ساہیتہ اکیڈمی دہلی، اردو اکیڈیمی دہلی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی وغیرہ کے علاوہ بہت سے ادارے اکیڈمیاں اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان مختلف علوم کے تراجم کرانے میں پیش پیش ہیں۔

ترجمہ کے بغیر دنیا کے اکثر کام انجام نہیں دیئے جاسکتے۔ قدیم زمانے سے لیکر ہمارے زمانے تک دنیا میں ہونے والی علمی، فنی، سائنسی اور ٹیکنیکل معلومات ہمیں ترجموں کے ذریعے ہی حاصل ہوتی ہیں۔ ہمارے زمانے میں فنی اور تکنیکی دریافتیں، انکشافات اور معلومات تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہیں۔ یہ دریافتیں اور معلومات ہر ملک کے لئے ضروری ہیں۔ چاہے ملک ترقی یافتہ ہو، ترقی پذیر ہو یا پسماندہ ہو اور یہ مقصد صرف اور صرف ترجمے کے ذریعے ہی پورا ہوسکتا ہے۔

ترجمہ ایک مشکل فن کی حیثیت رکھتا ہے اور بڑا مشکل کام ہے جو بڑی مہارت اور دریافت چاہتا ہے۔ ہر آدمی ترجمہ کا کام انجام نہیں دے سکتا، اس کام کو انجام دینے کے لئے میلان طبیعت اور شوق ہونا ضروی ہے، ایک زبان سے دوسری زبان میں صرف لفظی مفہوم بیان کر دینے کو مکھی پہ مکھی مارنا کہتے ہیں۔ اس لئے مترجم کے لئے ضروری ہے کہ ایک زبان کے معانی ومطالب کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرے کہ اصل عبارت کی خوبی اور اس کا مطلب جوں کا توں باقی رہے اور ساتھ ہی اس فن کے اصولوں اور زبانوں کی واقفیت رکھتا ہو۔ دونوں زبانوں کے مزاج، تہذیب، تمدن، کلچر الفاظ کی معنوی اور سوتی خوبیوں کا علم بھی رکھتا ہو تب جا کے ترجمہ کامیاب ہوسکتا ہے۔

ترجمہ ایک ایسی کھڑکی ہے جس سے جھانک کر ایک زبان کے لوگ دوسری زبان کے سماجی گروہوں یا قوموں کے حالات کی واقفیت حاصل کرتے رہتے ہیں۔ترجمہ کے ذریعے علم وفن کے میدانوں میں انسانی فتوحات ہم تک پہنچی ہیں۔اگر انسان ترجمے کے فن کا استعمال نہیں کرتا تو ہماری علمی روایات ہزاروں سال پیچھے رہ جاتیں۔مترجموں نے اپنی جدو جہد سے ہر قدم پر انسانی علم میں اضافہ کیا ہے۔ترجمہ کے ذریعے ہی ایک مخصوص ملک کسی بھی جغرافیائی علاقے اور کسی بھی خاص قوم کے حالات اور اس کے علوم وفنون حاصل کر کے تمام دنیا تک پہنچاتا ہے۔

ترجمے دنیا کی تقریباً سبھی زبانوں میں ہوتے ہیں جو لکھی اور بولی جاتی ہیں۔ترجمے کے اقسام فن اور اصولوں کے حوالے سے عالموں اور مترجموں نے مختلف طرح کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔مگر آج تک کوئی ایک ایسی مکمل کتاب سامنے نہیں آئی جس میں ترجمے کے بنیادی مسائل زیر بحث آئے ہوں اور ان مسائل کے حل بتائے گئے ہوں جس سے ترجمہ کرنے والے کو آگے چل کر اپنی راہ ہموار کرنے میں مدد مل سکے۔اپنی حدوں اور ذمہ داریوں کا علم ہو اور جسے وہ اپنی تربیت کے لئے استعمال کر سکے۔ترجمہ کرنے کے تین طریقے ہیں۔ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اصل متن کا صرف لفظی ترجمہ کر دیا جائے۔دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مفہوم لیکر آزادی کے ساتھ اپنی زبان کے روایتی انداز کو سامنے رکھتے ہوئے ترجمہ کیا جائے۔تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ترجمہ میں مصنف کے لہجے کی کھنک بھی باقی رہے اور اپنی زبان کا مزاج بھی باقی رہے اور ترجمہ اصل متن کے بالکل مطابق ہو۔اس قسم کے ترجمے کو معتدل ترجمہ کہتے ہیں۔

ترجمہ تین اقسام رکھتا ہے علمی ترجمہ، ابی ترجمہ اور صحافتی ترجمہ، علمی ترجمہ کی ذیل میں تمام سائنسی علوم وفنون کا ترجمہ آتا ہے۔یہ لفظی ترجمہ کے ذیل میں آتا ہے۔ادبی ترجمہ میں ضروری ہے کہ بامحاورہ ترجمہ کیا جائے اور صحافتی ترجمہ کو کھلا ترجمہ کہا جاتا ہے جہاں صرف مفہوم کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔

6.4 عمومی جائزہ

ترجمہ دراصل کسی متن کوایک تہذیبی فریم سے نکال کر دوسرے تہذیبی فریم میں پیش کرنے کا عمل ہے۔اس میں ایک تہذیب کے تصورات کو دوسری تہذیب کے پیکر میں ڈھالنا ہوتا ہے۔مترجم کا کام ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھنا نہیں بلکہ ایک تہذیبی معنویت کو دوسری تہذیبی معنویت میں منتقل کرنا ہے۔کوئی خاص لفظ اپنے تہذیبی پس منظر میں ایک منشور کی طرح ہوتا ہے جس سے تصورات کے کئی رنگ پھوٹتے ہیں لیکن دوسری زبان میں اس کا ہم معنی لفظ اپنے تہذیبی سیاق میں تصورات کی اس ست رنگی چھوٹ سے عاری ہوتا ہے۔اس لئے ترجمے میں مکھی پر مکھی بٹھانے سے کام نہیں چلتا۔مترجم کو اصل متن کے تہذیبی تصورات کی ترجمے کی زبان میں بازآبادکاری کرنی پڑتی ہے۔اس کیلئے مصنف کو زبان کے تہذیبی عناصر اور اس کے تہذیبی رچاؤ سے واقف ہونا ضروری ہے۔آج کل ترجمے سے ایک اور تقاضہ یہ بھی کیا جارہا ہے کہ ترجمہ اصل زبان کے اسالیب اور طرز احساس کو ترجمے کی زبان میں اس طرح منتقل کرے کہ ترجمے کی زبان اس سے متاثر ہو۔کیونکہ ایسے ترجمے سے حقیقت میں کوئی فائدہ نہیں پہنچتا جو سلامت وروانی تو پیدا کردے لیکن مصنف کی روح،اس کے لہجے اور تیور کو ہم سے دور کردے اور ساتھ ساتھ جس زبان میں ترجمہ کیا گیا ہو اس کے مزاج کو اسی طرح روایتی روش اور اظہار بیان قائم رکھے اور اس میں کسی اضافے،اسلوب کے نئے امکان یا بیان کے نئے تجربے کی کوشش نہ کرے۔

اردو میں باقاعدہ ترجمے کی روایت دوڈھائی سو برس پرانی ہے ۔اس کا آغاز قرآن شریف کے ترجمے اور بزرگوں کے اقوال وہدایات سے ہوا تھا۔مدرسہ غازی الدین (قیام:۱۷۹۲ء) جو بعد میں ترقی کر کے اورینٹل کالج دہلی بنا جس میں علمی اور تعلیمی سرگرمیوں کے تحت ترجمے کرائے گئے۔یہاں شعبہ مشرقیہ میں سنسکرت،عربی وفارسی کے علاوہ سماجی علوم اور جدید مغربی سائنس کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔فورٹ ولیم کالج،کلکتہ (قیام: ۱۸۰۰ء) میں اردو زبان وادب اور اس کے علمی وتعلیمی میدان میں ترجمے کے ذریعے ہی ایک انقلاب آیا۔سائنٹفک سوسائٹی،علی گڑھ (قیام:۱۹۰۳ء) کے مقاصد میں اردو زبان کو فروغ دینا،اردو میں جدید علوم پر تصنیف وتالیف کا کام کرنا،دنیا کی اہم کتابوں کے اردو میں ترجمے کرانا تحقیق کے سائنٹفک اصولوں کی مدد سے اردو کے کلاسیکی سرمائے کو ترتیب دینا وغیرہ

اہم شاغل شامل تھے۔ یہاں ایک بڑا نام جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) کا آتا ہے جہاں دارالترجمہ عثمانیہ کا قیام ۱۹۱۷ء میں عمل میں آیا۔ جامعہ عثمانیہ میں قدیم وجدید، مشرقی ومغربی علوم وفنون کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ اس مقصد کے پیش نظر دارالترجمہ میں نصاب کی تیاری کے لئے تصنیف وتالیف کا کام شروع ہوا۔ انجمن پنجاب اوراورینٹل کالج لاہور نے بھی متعدد علمی، ادبی اور سائنسی کتابوں کا ترجمہ کر کے انہیں شائع کیا ہے۔ ہندوستان کی مرکزی حکومت کے زیرنگرانی اردو کی ترقی اور بقا کے لئے ترقی اردو بیوروقائم ہوا (قیام: ۱۹۷۱ء) جوآج قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان کے نام سے جانا جاتا ہے یہاں تعلیم، ادب، سائنس اوردوسرے جدید علوم کی کتابوں کی تیاری اوران کی اشاعت کے علاوہ ترجمے کا کام بھی ہوتا ہے۔

6.5 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ ترجمہ نگاری کے فروغ میں فورٹ ولیم کالج کی خدمات کا جائزہ لیجئے۔

2۔ ترجمہ نگاری کے ارتقا میں دارالترجمہ عثمانیہ اور دیگر ادبی اداروں کی خدمات پر روشنی ڈالئے۔

3۔ فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج اور دارالترجمہ عثمانیہ میں ترجمہ کی گئی کتب پر اپنے تاثرات قلم بند کیجئے۔

6.6 امدادی کتب

1۔ وثائق فورٹ ولیم کالج، از راجندر ناتھ شیدا

2۔ دارالترجمہ عثمانیہ کی علمی وادبی خدمات، از ڈاکٹر مجیت الاسلام

3۔ مرحوم دہلی کالج، از مولوی عبدالحق

4۔ فن ترجمہ نگاری، از ظہورالدین

اکائی نمبر 7: منظوم ترجمہ

ساخت:

7.1 تمہید

7.2 مقاصد

7.3 منظوم ترجمہ

7.4 عمومی جائزہ

7.5 سوالات

7.6 امدادی کتب

7.1 تمہید

شاعری کا ترجمہ انتہائی مشکل و پیچیدہ عمل ہے۔شاعری کے ترجمے کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ترجمے کے بعد بھی شاعری رہے۔ عجیب قسم کا نثری نمونہ نہ بن جائے۔بعض ماہرین کا خیال ہے کہ نظم کا ترجمہ نظم میں ہی ہونا چاہئے۔نثری ترجمے سے اس کا شعری لطف زائل ہوجاتا ہے۔ چونکہ ہر زبان کا عروضی اور صوتی نظام جدا ہوتا ہے اور مختلف اثرات کا حامل ہوتا ہے اس لئے شاعری کی اصلی کیفیت کا ترجمہ ناممکن ہے۔دوسرا مسئلہ ترسیل وابلاغ کا ہے۔ شاعری چونکہ رمز وایما اور علامتی اسلوب کی حامل ہوتی ہے اور زندہ علامتیں اپنے اندر کئی معنوی جہت رکھتی ہیں۔اس لئے علامتی لفظ کے بدلنے سے نظم کی پوری کائنات درہم برہم ہوجاتی ہے۔شاعری میں معنی آفرینی کی خوبی زبان و بیان اور لفظیات کے مخصوص استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔رعایت لفظی مناسب الفاظ، کے صوتی پیکر، ان کی غنائیت سب کچھ

مل کر شعری معنی کی تشکیل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ترجمے کے عمل میں ان تمام امور کا ایک ساتھ منتقل ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ شاعری کے ترجمے میں صرف شاعرانہ خیال یا اس کا مضمون ہی ترجمہ ہو پاتا ہے بقیہ فنی تزاکتیں زائل ہو جاتی ہیں۔ شعری ترجمے کے ان ہی مسائل کے پیش نظر شبلی نے شاعری کے ترجمے کو شاعری کی موت قرار دیا تھا۔

7.2 مقاصد

اس اکائی میں منظوم ترجمے کی تعریف، اصول، مسائل اور روایت پر بحث کی گئی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ منظوم ترجمہ کس طرح کیا جاتا ہے۔ منظوم ترجمہ کرتے وقت ترجمہ نگاری کے کن فنی لوازمات کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ اصطلاحات کس طرح برتی جاتی ہیں اور منظوم ترجمے میں ان کی اہمیت کیا ہے۔ منظوم ترجمے کے لئے کن اصولوں کو اپنانا ضرور ہے اور دورانِ منظوم ترجمہ مترجم کو کن مسائل سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ اردو میں منظوم ترجمہ کی روایت کب اور کس طرح شروع ہوئی اور پھر کس طرح اپنی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی عصر حاضر تک پہنچی۔ ان مذکورہ نکات کو ابھارنا ہی اس اکائی کا اہم مقصد ہے۔

7.3 منظوم ترجمہ

شعر کا شعر میں ترجمہ منظوم ترجمہ کہلاتا ہے۔ کسی بھی شعری تخلیق کو جب ہم اس کے مرکزی خیال اور مجموعی تاثیر کے ساتھ دوسری زبان میں شعری عمل کے ذریعے ڈھالتے ہیں تو اسے منظوم ترجمہ کہا جاتا ہے۔

منظوم ترجمے کے وقت ہیئت و فارم کا تعین بھی بے حد ضروری ہے۔ اردو شاعری کی اصناف اپنی الگ الگ خصوصیات رکھتی ہیں۔ اصناف شعر ہر زبان میں الگ بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً غزل فارسی میں ہے انگریزی میں نہیں ہے۔ مترجم کو یہ چاہئے کہ شعری متن جس ہیئت میں ہے اس کے قریب ترین جو ہیئت ترجمے کی زبان میں ہو اس کا انتخاب

کرے تا کہ اصل فن پارے کی بیشتر شعری خصوصیات ترجمے میں منتقل ہوسکیں۔ منظوم ترجمے میں ایک اور خوبی ہونی چاہئے جس زبان میں منظوم ترجمہ کیا جائے اس زبان کی شاعری کے معیار پر اسے پورا اترنا چاہئے ۔ منظوم ترجمے کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ لفظی ترجمہ آزاد ترجمہ، ماخوذ ترجمہ اور تخلیقی ترجمہ۔ محض لفظی ترجمہ ہر قسم کی تخلیقی خصوصیات سے محروم ہوتا ہے اور مکھی پر مکھی بٹھانے کا کام کیا جاتا ہے۔ آزاد ترجمے میں شعری تخلیق کے مرکزی خیال اور مجموعی تاثراتی فضا کو برقرار رکھتے ہوئے ترجمے کا فریضہ انجام دیا جاتا ہے۔ اس طرح کے ترجمے بڑی حد تک ترجمے کی زبان کے شعری لوازم سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ ماخوذ ترجمہ بھی اس سے قریب ہوتا ہے اس میں اصل شعری تخلیق سے مرکزی خیال اخذ کیا جاتا ہے۔ لیکن شاعر اپنے افکار وخیالات اور اپنے تجربات، احساسات اور کیفیات وتاثرات کو اپنے دل ودماغ پر اس طرح طاری کر لیتا ہے کہ وہ اس کے تخلیقی عمل کا حصہ بن جائے پھر اپنی زبان میں اسے اسی طرح پیش کرتا ہے کہ اس کی حیثیت باز تخلیقی ہوجاتی ہے۔

شاعری کا ترجمہ کرنا ایک مشکل عمل ہے ۔ شاعری کے ترجمے کے وقت مترجم کو شاعر کے Tention conflict اور Compromise کو سمجھ لینا چاہئے۔ الفاظ کے معنی ومطالب سے صلح کرنے کے لئے مترجم کو جنگ بھی کرنی پڑتی ہے اور صوتی تاثر کے لئے الفاظ کی ایک ایک آواز کو ناپنا اور تولنا پڑتا ہے۔ غرض ایک لمبی تراش خراش اور تلاش وکاوش کے بعد روح کو صحیح قالب ملتا ہے۔ شاعری کے ترجمے کے وقت ہیئت اور فارم کا صحیح فیصلہ کرنا بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اردو میں غزل، نظم، رباعی، مثنوی، مرثیہ اور قصیدہ وغیرہ مختلف اصناف سخن ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی اپنی الگ خصوصیات اور اپنا الگ طرز بیان اور فضا ہے۔ ظاہر ہے ہر ادب میں یہ اصناف رائج نہیں ہے۔ اس لئے ترجمے والی مروج اصناف میں سے کسی ایک صنف کو اپنے مقصد کے لئے اس طرح چننا چاہئے کہ وہ سارے تقاضے پورے کرے۔ شاعری کے ترجمے میں صرف مرکزی خیال کو ہی ظاہر کر دینا کافی نہیں ہے۔ ہمیں وہ تاثر بھی پیش کرنا چاہئے جو اصل کو پڑھ کر قاری کے ذہن میں قائم ہوا ہے۔

نثری ترجمے کے مقابلے میں منظوم ترجمے کے مشکلات زیادہ ہیں۔طبعی علوم کے علاوہ ہر علم کی اصطلاحیں آہنی سانچے کی طرح قطعی نہیں ہوتیں، بلکہ طبیعیات کی بعض اصطلاحوں اور تعریفوں میں قطعیت نہیں ہوتی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر زبان میں لفظوں کے بہت متعین معنی نہیں ہوتے یہی نہیں زیادہ لفظ ایسے ہیں جن کے ایک سے زیادہ معنی ہوتے ہیں۔اور بعض وقت ایک ہی لفظ کے دو متضاد معنی بھی ہوتے ہیں۔شروع میں ایک ہی مفہوم رہا ہوگا۔وہ بنیادی معنی آج بھی لغوی معنی ہیں۔لیکن ہر لفظ کے لغوی معنی کے علاوہ اصطلاحی معنی بھی ہوتے ہیں۔اور ان میں وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔اصطلاحوں میں ظاہر ہے لفظ ہی ہوتے ہیں۔اگر ہر علم کی اصطلاح ایسی ہو، جو صرف اسی کے لئے مخصوص ہو تو افراتفری کم ہو جاتی ہے۔لیکن پھر دوسری قسم کی افراتفری پیدا ہوتی ہے جو تعریف وضع کی جاتی ہے۔منتہی کو کنفیوژن نہیں ہوتا، لیکن مبتدیوں کے لئے یہ پہلو افراتفری پیدا کرتا ہے۔

عام طور پر شاعری کا ترجمہ سب سے مشکل مانا جاتا ہے۔اس لئے کہ شاعری کی اصناف میں فن کی نازک خوبیاں بہت ہوتی ہیں، جن کے ترجمے میں دشواری پیش آتی ہے۔پھر یہ کہ اکثر زبانوں کی شاعری میں اصناف الگ الگ ہوتی ہیں۔ان کے موضوعات اور فنی تقاضے بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ان کو ترجمے میں قائم رکھنا مشکل ہوتا ہے۔مثلاً اردو زبان میں غزل، مرثیہ اور ریختی جیسی اصناف ہیں۔انگریزی یا جرمن زبان میں ان کا وجود نہیں۔اس لئے ان زبانوں میں ان اصناف کا کامیاب ترجمہ کرنا بہت مشکل ہوگا۔اس مشکل پر قابو پانے کے لئے شاعری کے ترجمے میں بالعموم دو طریقے برتے جاتے ہیں۔

1۔ شعری تخلیق کی ہر سطر کا لفظی ترجمہ کر کے اس کے مفہوم یا شاعر کے تجربے کی کیفیت کو ادا کرنا۔

2۔ شعری تخلیق یا نظم کے مطالعے سے مترجم کے ذہن میں جو تاثر پیدا ہو، معنوی اور جمالیاتی شاعر کے جس تجربے کی ترسیل ہوا پنے الفاظ میں اس کی بار آفرینی کر کے یعنی اس نظم کے خیال یا تجربے کو دوبارہ اس طرح جنم دے کہ وہ اپنے آپ میں ایک تخلیق کا درجہ اختیار کر لے۔ولیرؔی کے مطابق مترجم کی وفاداری اصل شاعر یا اس کی تخلیق سے

نہیں بلکہ اس تاثر سے ہوگی جو وہ تخلیق مترجم کے اندر پیدا کرے گی۔

اردو ادب میں باقاعدہ شعری ترجمے کا آغاز گولکنڈہ کے فرمان روا محمد قلی قطب شاہ کے عہد (۱۵۸۰۔۱۶۱۱) اور اس کی شاعری سے ہوتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں دکنی ادیبوں اور شعرا کا فارسی کی طرف زیادہ رجحان تھا جس کے نتیجے میں اس عہد میں ترجمے پر بھی باقاعدہ توجہ دی گئی۔ جمیل جالبی کے مطابق قلی قطب شاہ نے حافظؔ کی غزلیں اردو میں ترجمہ کی ہیں۔ اسی عہد میں شیخ احمد گجراتی نے مولانا جامیؔ اور امیر خسروؔ کی فارسی مثنویوں ''یوسف زلیخا'' کا ترجمہ اسی عنوان سے مثنوی کی صورت میں سن ۱۵۸۰ء سے ۱۵۸۸ء کے درمیان میں کیا ہے۔ ۱۶۳۱ء میں غواصیؔ نے ''ہتوپدیش'' کے بخشیؔ کے فارسی ترجمے ''طوطی نامے'' کا اسی عنوان سے اردو میں ترجمہ کیا۔ ۱۶۴۰ء میں بیجاپور کے سلطان محمد عادل شاہ کی فرمائش پر ملکؔ خوشنود نے فارسی مثنوی ''یوسف زلیخا'' اور امیر خسروؔ کی مثنوی ''ہشت بہشت'' کا ترجمہ ''جنت سنگھار'' کے عنوان سے کیا۔

۱۶۴۰ء میں کمال خاں رستمی کا ترجمہ ''خاور نامہ'' جو اردو کی سب سے طویل مثنوی ہے۔ جو ۲۴ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ مثنوی اردو کے شعری تراجم میں بہت اہم اور اصل کے مطابق ہے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کے قیام کے بعد اردو میں مغرب کے تخلیقی ادب کے تراجم کا آغاز ہوا۔ اردو میں باقاعدہ اینتھولوجی انتخاب کا آغاز ضامن کنتوری کی کتاب ''ارمغان فرنگ'' سے ہوا جو ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔ بیسویں صدی میں انگریزی کے ساتھ مغرب کی دوسری زبانوں کے شعر و ادب کے ترجمے پر بھی زیادہ توجہ دی گئی۔ بیسویں صدی میں معنی و خیال پر زیادہ زور دینے کی وجہ سے بیشتر انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں کی شاعری کا ترجمہ نثر میں کیا گیا۔ نظم کی اس قلب ماہیت کے باوجود شعری تاثر کافی حد تک قائم رہتا ہے۔

اردو میں منظوم تراجم کی روایت پر نظر ڈالیں تو انشاء اللہ خاں انشاء کی مثنوی ''فیل'' کو انگریزی شاعری سے کیا ہوا اردو کا پہلا منظوم ترجم قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ ترجمہ اصل متن کو سامنے رکھ کر نہیں کیا گیا بلکہ ایک فاسی ترجمے کی

روشنی میں کیا گیا ہے۔ یوں یہ ترجمہ درترجمہ ہے۔ یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ جب اردو شاعری میں انگریزی زبان و ادب سے درآمد کا سلسلہ شروع ہوا تو منظوم ترجمہ کی روایت کی ابتدا اردو کے عظیم المرتبت شاعر نے اس شان سے کی کہ نصف صدی سے زائد عرصہ تک کوئی اور اس میدان میں نہ آ سکا۔ یہ مثنوی انشاء نے نواب سعادت علی خاں کی فرمائش پر ۱۷۹۲ء میں لکھی تھی۔ دراصل یہ انگریزی نظم تھی۔ انشاء نے فارسی ترجمے کی مدد سے منظوم ترجمہ کیا۔ دوسو پانچ اشعار کی یہ مثنوی نہایت پرلطف مثنوی ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں اس مثنوی کا عنوان ''ہاتھی اور چینچل پیاری ہتھنی کی شادی'' دیا ہے۔ مثنوی کی اندرونی شہادت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصل انگریزی نظم جان کارش نے لکھی تھی۔ اس کا فارسی ترجمہ کلاک صاحب نے کیا تھا۔ نواب سعادت علی خاں کی فرمائش پر انشاء نے اس کو اردو کا جامہ پہنایا۔ دوسرا ترجمہ جس کا ذکر گارساں دتاسی نے اپنے خطبات میں کیا ہے، GayDoFables یعنی فیبل کی حکایتوں کا منظوم ترجمہ ہے۔ یہ منظوم ترجمہ کلکتہ کے راجہ کالی کرشن بہادر نے کیا۔ گارساں دتاسی کی مطابق:

> ''حضرت سلیمان کی کہاوتوں اور پہاڑی وعظ کا بھی اردو نظم میں ترجمہ ہوا اور شیو پرشاد نے ''من بہلاؤ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں انگریزی نظم اور نثر دونوں کے ترجمے شامل ہیں۔''

انیسویں کے بعد ترجموں کی رفتار میں تیزی پیدا ہوئی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں سرسید کی تحریک کے زیرِ اثر برصغیر کے مسلمانوں کی علمی، ادبی اور ثقافتی زندگی پر انقلابی اور دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ اردو شاعری بھی ان اثرات سے متاثر ہوئی۔ چناں چہ محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالؔی نے انجمنِ پنجاب کی سرکردگی میں اردو شاعری کی اصلاح کی تحریک چلائی اور اردو شاعری کو نئے خیالات اور نئے اسالیب سے روشناس کرنے کے مقصد کے تحت انگریزی شاعری سے منظوم ترجموں کا نہ صرف مشورہ دیا بل کہ خود منظوم ترجمے کیے۔

سرسید، الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد انگریزی بہت کم جانتے تھے لیکن انگریز پروفیسروں سے برابر ملتے رہتے تھے اور ان سے تبادلہ خیالات کرتے رہتے تھے۔ آزاد نے یہ منظوم ترجمے کیے، معرفتِ الٰہی، بڈھا باپ، اولوالعزمی کے لیے کوئی سدراہ نہیں۔

آخری نظم، نظمِ آزاد میں موجود ہے۔اس نظم کے متعلق محمد حسین آزاد کے فرزند محمد ابراہیم، نظمِ آزاد کی تمہید میں لکھتے ہیں:

> ''کرنل ہالرائیڈ کے مشاعرہ کے بند ہونے کے بعد آزاد کبھی کبھی انگریزی نظموں کے انداز پر نظم لکھتے رہے۔ یہ بالکل انگریزی نظم کا ترجمہ نہیں ہے چناں چہ ناظرین مقابلہ کر کے دیکھیں گے کہ انگریزی نظم کے انداز پر جو نظم یعنی 'اولوالعزمی کے لیے کوئی سد راہ نہیں' وہ ترجمہ نہیں ہے البتہ انگریزی مطالب کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ اس طرح تمام نظموں میں انگریزی مطالب ہیں مگر ان کو نہیں کہہ سکتے کہ انگریزی ترجمہ ہیں۔''

حالؔی نے ''دوست''، ''قدر و منزلت کس جگہ ہوتی ہے'' کے عنوان سے انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کیے۔ اسی طرح ''زمزمۂ قیصری'' جو مسٹر سٹوک کی انگریزی نظم ہے، اصل نظم کا نثری ترجمہ مولانا حالی کو دیا گیا۔ انھوں نے ان خیالات کو منظوم کیا۔ اسی طرح ''تنہائی کا خیال'' انگریزی سے لیا گیا ہے۔ ان کی نظم ''جواں مردی کا کام'' انگریزی نظم کا آزاد منظوم ترجمہ ہے۔

۱۸۶۴ء میں منظوم ترجموں کی باضابطہ کوشش کی حیثیت سے قلق میرٹھی کی ''جواہر منظوم'' منظرِ عام پر آتی ہے۔ جسے انگریزی شاعری کے اردو منظوم ترجموں کا پہلا مجموعہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے حصہ دوّم کا منظوم ترجمہ بانکے بہاری لال نے ''گوہر شب تاب'' کے نام سے کیا۔ اسی طرح رحیم اللہ نے انگریزی کتاب ''منتخب انگریزی نظموں کا مجموعہ'' کا منظوم ترجمہ کیا۔ بانکے بہاری لال اور رحیم اللہ دونوں نے بیس انگریزی نظموں کے ترجمے کیے ہیں۔

ڈاکٹر حسن الدین کے مطابق:

''مذکورہ تراجم کو ادب کی اعلیٰ قدروں اور اردو شاعری کے بلند معیار پر جانچا
جائے تو ان میں بہت سی خامیاں نظر آتی ہیں۔ تاہم ان تراجم کا مطالعہ
ترجموں کے ارتقا کے اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔''

۱۸۸۰ء میں مولانا اسماعیل میرٹھی کی پینتالیس نظموں کا مجموعہ ''ریزۂ جواہر'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں حسبِ ذیل چھے نظمیں انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی شامل تھیں۔ کیڑا، ایک قانع مفلس، موت کی گھڑی، فادر ولیم، حب وطن، انسان کی خام خیالی اسماعیل میرٹھی نے اور نظموں کے بھی منظوم تراجم کیے ہیں جن میں بیش تر نظمیں بچوں کے لیے ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر تک انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں میں خاص دلچسپی لی جانے لگی اور ان کے معیار اور فنی ضروریات کا خاص لحاظ ہونے لگا۔ اب یہ کام عہدہ داروں کے حکم اور فرمائش پر نہیں بل کہ خود اہلِ اردو کی اپنی دلچسپی سے ہونے لگا۔ اب یہ کام انگریزی نصاب کی کتابوں میں شامل نظموں کے منظوم ترجموں تک محدود نہ رہا بل کہ انگریزی شہ پاروں کو اردو میں منتقل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔

اکبرالہ آبادی اردو کے ایک اور بڑے شاعر ہیں جنھوں ایک ہی نظم کے ذریعے ترجموں کے میدان میں اپنا مقام پیدا کرلیا۔ ان کی نظم ''آب لڈور'' انگریزی شاعر رابرٹ سدے کی نظم "The Ladore of Cataract" سے ماخوذ ہے۔ ماخوذ نظموں پر منظوم ترجموں کا ادراک نہیں ہوتا، پھر بھی اس نظم کا ذکر ضروری ہے۔ اس نظم کے حوالے سے اکبرالہ آبادی خود فرماتے ہیں، ''میری نظم میں اب لوڈور کے آبشار کی چھاؤں تک موجود نہیں۔'' غالباً اکبرالہ آبادی کا مفہوم یہ ہے کہ روایتی معنوں میں یہ منظوم ترجمہ نہیں ہے۔ نظم طباطبائی کی ''گورِ غریباں'' سے اردو کی پابند نظم میں ایک نئے انداز کی ابتدا ہوتی ہے۔ نظم طباطبائی اردو کے بلند پایہ شاعر تھے۔ انھوں نے اردو شاعری کو ہیئت کے نئے تجربوں

سے روشناس کرایا۔ انھوں نے انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں کی طرف توجہ کی۔ طباطبائی کے منظوم ترجموں میں سب سے طویل اور اہم نظم ''گورِ غریباں'' ہے۔

نظم طباطبائی نے ''گورِ غریباں'' کے علاوہ چند اور انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کیے ہیں جو یہ ہیں۔ رحم، زمزمہ فصل بہار، نغمہ زندگی، دولت خداداد افغانستاں، یادرفتگان، دعوت زہرا، اس طرح وطن کی خیر مناتے ہیں، ہمدردی وثابت قدمی۔ یہ سب منظوم ترجمے بہت مقبول ہوئے اور ان سے منظوم ترجموں کی تحریک کو زبردست تقویت پہنچی۔ نظم طباطبائی نے چند نظمیں انگریزی نظموں کی اتباع میں لکھیں جو ہیئت کے اعتبار سے اہمیت رکھتی ہیں۔

انگریزی شاعری کے منظوم ترجموں کی رفتار کو تیز کرنے میں ادبی رسالوں نے اہم کردار ادا کیا۔ اسی سلسلے میں رسالہ ''مخزن'' نے بالخصوص انگریزی نظموں کے ترجموں کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ اس رسالے کے اجرا کا بنیادی مقصد ہی منظوم ترجموں کی ترویج تھا۔ اپنے پہلے شمارے میں جو اپریل ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا تھا، اس مقصد کو اس طرح واضح کیا گیا ہے:

> ''انگریزی نظموں کے نمونے پر طبع زاد نظمیں اور انگریزی نظموں کے
> بامحاورہ ترجمے شائع کرنا تاکہ معتقدین کی تقلید کرنے والے جدید مذاق
> سے آگاہ ہوں۔''

رسالہ دلگداز نے اس مقصد کو آگے بڑھایا۔ بیسویں صدی کے پہلے اور دوسرے عشرے میں کثیر التعداد انگریزی نظموں کو اردو کا جامع پہنایا گیا۔ ان تراجم سے اردو شاعری کے سرمایہ میں قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ پروفیسر سید محمد عبدالغفور شہباز نے اس دور میں کامیاب اور معیاری منظوم ترجمے کیے۔ آپ کا ایک منظوم ترجمہ ''جوگی'' ہے جو انگریزی نظم ''دی ہرمٹ'' کا لفظی ترجمہ ہے۔ شہباز نے انگریز شاعر سدے کی نظم سے ماخوذ ایک نظم ''آبشارِ لوڈور'' لکھی۔ یہ نظم اکبرالہ آبادی کی ''آبِ لوڈور'' سے ماخوذ ہے۔ انھوں نے ایک انگریزی نظم ''ابراہیم بن ادھم'' کا بڑا عمدہ منظوم ترجمہ کیا ہے۔

عبدالحلیم شرر نے نہ صرف منظوم ترجمے کیے بل کہ انگریزی نظم کے طرزِ بیان اور ہیئت کی اتباع میں غیر مقفّی نظم کا تجربہ کیا۔ شرر نے اردو نظم میں اس جدید اسلوب اور ہیئت کو مروّج کیا اور اس کو بہ طور ایک تحریک فروغ دیا۔ عبدالحلیم شرر نے مغربی شاعری سے براہِ راست استفادہ کے رجحان کو استحکام بخشا اور اس کے ذریعہ اردو شاعری کو نئی وسعتوں سے آشنا کیا۔ نادر کاکوروی اور علامہ اقبال دونوں کی نظمیں ''مخزن'' میں چھپا کرتی تھیں۔ دونوں کے درمیان غالباً ذاتی روابط بھی تھے۔ اقبال کے بعض اشعار میں نادر کاکوروی کا ذکر ملتا ہے:

پاس والوں کو تو آخر دیکھنا ہی تھا مجھے
نادرِ کاکوروی نے دور سے دیکھا مجھے

نادر و نیرنگ ہیں اقبال میرے ہم صفیر
ہے اسی تثلیث فی التوحید کا سودا مجھے

''شاعر کا دل'' ٹینی سن کی ایک نظم کا ترجمہ ہے۔ نادر نے ترجمہ کی صحت کا اتنا خیال رکھا ہے کہ جہاں کہیں مضمون کی وضاحت کے لیے کچھ الفاظ اپنے اشعار میں بڑھائے ہیں، وہاں ان کے گرد خطوطِ وحدانی (بریکٹس) کھینچ دیے ہیں۔ ''مرحومہ کی یاد میں'' ٹامس مور کی نظم کا ترجمہ ہے۔ اسی طرح انھوں نے سر ٹامس مور کی مشہور نظم ''لائٹ آف دی حرم'' کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ بعض تراجم میں مثلاً ''گھنٹہ نہیں بجے گا'' نادر نے انگریزی نظم کو اردو میں منتقل کرتے ہوئے وضاحتی پیرایہ اختیار کیا ہے۔ لیکن اس غیر معمولی کامیابی کو دیکھ کر جو اس منظوم ترجمے کو حاصل ہوئی، اس آزادی کا جواز پیدا ہوتا ہے۔

مولانا ظفر علی خاں نے کئی انگریزی کی تحریروں کو اردو کا روپ دیا۔ انھوں نے مندرجہ ذیل نظموں کے منظوم تراجم بھی کیے ہیں۔ ندی کا راگ، اخبار کا چندہ، تاجدارِ دکن، دھوپ اور چاندنی، فراقِ روح وتن۔ غلام بھیک نیرنگ کے منظوم تراجم ''مقصودِ الفت'' اور ''جانِ شیریں'' میں بھی حسن کارانہ تناسب پایا جاتا ہے۔ ان کے منظوم تراجم ''مخزن''

میں شائع ہوتے رہے۔مولوی فخرالدین احمد سفیر کاکوروی کے کلام میں بھی منظوم تراجم ملتے ہیں۔ان کے مجموعہ کلام کا مقدمہ سر شیخ عبدالقادر نے لکھا تھا لیکن یہ مجموعہ شائع نہ ہوسکا اور ۱۹۷۴ء کے حادثے میں ضائع ہوگیا۔انھوں نے سروجنی نائیڈو کی کئی نظموں کو اردو کا جامہ پہنایا۔سروجنی نائیڈو نے سورہ اخلاص سے متاثر ہوکر انگریزی میں ایک نظم کہی تھی۔ انھوں نے ''اسمائے حسنیٰ'' کے عنوان سے اس نظم کا اردو ترجمہ کیا۔ان کے مندرجہ ذیل تراجم قابلِ ذکر ہیں۔گجری، حسین ساگر،نسترن،نغمہ صحرائی،نوائے آوارگی۔

سید محمد ضامن کنتوری نے منظوم ترجموں کی جانب خصوصی توجہ دی۔۱۹۱۰ء میں ''ارمغانِ فرنگ'' شائع ہوئی جس میں مشہور انگریز شاعروں مثلاً ورڈزورتھ، پوپ، گولڈسمتھ، شیکسپیئر، لانگ فیلو وغیرہ کی نظموں کا انتخاب کرکے شاعروں کے مختصر حالاتِ زندگی کے ساتھ منظوم تراجم کیے گئے ہیں۔ان کے منظوم ترجمے ''راہبِ صحرانشیں'' اور ''اینک آرڈن'' طویل ہوتے ہوئے بھی دل چسپ اور کامیاب ہیں۔ان کا منظوم ترجمہ ''نسیم سحر'' حیدرآباد کے ایک رسالہ ''معلم النسواں'' میں ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا۔اقبال کی نظم ''پیامِ صبح'' اس کا ہم ترجمہ ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی منظوم تراجم کے حوالے سے اردو شاعری کا ایک بڑا نام علامہ اقبال سامنے آتا ہے۔علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور ہی میں منظوم ترجموں کی طرف توجہ کی۔ان کی شاعری کے اس رجحان کی طرف پروفیسر عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب ''جدید اردو شاعری'' میں یوں اشارہ کیا:

> ''اقبال کی ابتدائی شاعری کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو مغربی شعرا جیسے ٹینی سن، ایمرسن، گوئٹے وغیرہ کے کلام سے ماخوذ ہے۔یہ درحقیقت اقبال کی موضوعی نظموں کا اوّلین نقش ہیں۔''

اقبال نے انگریزی ادب کا غائر مطالعہ کیا تھا۔یورپ اور انگلستان کے قیام اور وہاں کی تعلیم کے دوران انگریزی ادب سے ان کی دل چسپی میں اضافہ ہوا تھا۔اپنے ہم عصر ادیبوں کی طرح ان کی بھی خواہش تھی کہ مغربی ادب

کے فن پاروں سے اردو ادب کو مالا مال کریں۔ جب اقبال یورپ سے واپس آئے تو ''مخزن'' کے ایڈیٹر شیخ عبدالقادر نے ان سے فرمائش کی کہ وہ انگریزی نظموں کے منظوم ترجموں کی طرف توجہ کریں۔ ''مخزن'' کے پہلے شمارے اپریل ۱۹۱۰ء میں اقبال کی نظم ''کوہستانِ ہمالہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی جس پر ایڈیٹر کی طرف سے یہ نوٹ درج ہے:

> ''شیخ محمد اقبال صاحب جو علوم مشرقی و مغربی دونوں میں صاحبِ کمال ہیں۔
> انگریزی خیالات کو شاعری کا لباس پہنا کر ملک الشعرائے انگلستان ورڈس
> ورتھ کے رنگ میں کوہِ ہمالہ کو یوں خطاب کرتے ہیں۔''

اقبال کے ابتدائی کلام میں انگریزی شاعری کی صدائے بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔ رسالہ ''مخزن'' (جنوری ۱۹۰۴ء) میں انگریز شاعر ڈانک کے تین شعروں کا ترجمہ شامل ہے۔ اقبال کے تراجم کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر حسن الدین لکھتے ہیں:

> ''اقبال نے اپنے ترجموں میں آزادی سے کام لیا ہے۔ ان کے سب ترجمے
> آزاد یا نیم آزاد کی تعریف میں آتے ہیں۔ اقبال کے اپنے معیار اور تخلیقی
> صلاحیت کے پیشِ نظر ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ اصل نظم کے پابند ہو جاتے۔
> انھوں نے ان منظوم ترجموں میں انگریزی نظموں کے خیالات سے استفادہ
> کیا لیکن بسا اوقات اپنی نظموں کی تشکیل اپنے ذاتی اور فکری رجحان کے تحت
> کی۔ اقبال کے سب ترجمے وفادار نہ سہی، خوب صورت ضرور ہیں۔۔۔۔
> اقبال کے تمام منظوم ترجمے نہ صرف اردو شاعری کا جزو بن گئے ہیں، بل کہ یہ
> مختصر ذخیرہ اتنا قیمتی ہے کہ اردو شاعری اس پر ناز کر سکتی ہے۔''

7.4 عمومی جائزہ

زندہ زبانیں متحرک تہذیبوں کی علم بردار ہوتی ہیں، اس لیے فکری اور فنی سطح پر کئی حوالوں سے ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ترجمہ نگاری کا فن بھی اسی اثر پذیری کا غماز ہے۔ ایک زبان میں بیان شدہ خیال اپنی بے پناہ قوت اور اثر آفرینی کی وجہ سے ترجمے کی صورت دوسری زبان میں منتقل ہوتا ہے۔

اردو زبان کے ادبی سرمایے میں یہ بات اہم ہے کہ اردو کے اہلِ قلم نے جہاں تخلیقی سطح پر اپنے کام کو آگے بڑھایا وہاں دوسری زبانوں کے شعری، افسانوی اور علمی ذخیرے کو اردو میں ترجمے کے ذریعے منتقل کیا۔ جہاں تک شعری تراجم کی روایت کی بات ہے تو یہ کام اتنے وسیع پیمانے پر ہوا ہے کہ بعض اہلِ قلم نے اسے ایک الگ صنفِ شاعری قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر حسن الدین احمد رقم طراز ہیں:

> ''منظوم ترجموں کو اردو شاعری کی ایک علاحدہ صنف قرار دیا جا سکتا ہے جس کی طرف اس وقت تک کم توجہ دی گئی ہے۔ اس مقالہ کا مقصد اس اہم صنف ادب کی جانب اہلِ اردو کو متوجہ کرنا ہے اور اس وقت تک جو جواہر پارے عام نظروں سے اوجھل رہے ہیں، ان کو سامنے لا کر ان کی ادبی قدر و قیمت کا تعین کرنا ہے۔''

منظوم ترجمہ نگاری بہت سی باریکیوں اور فنی نزاکتوں کی متقاضی ہے۔ شاعری بنیادی طور پر احساسات و جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ ہر زبان اپنے اظہار کے حوالے سے تہذیبی پس منظر کی حامل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک زبان کا تہذیبی منظر نامہ لفظی اور اسلوبیاتی سطح پر دوسری زبان میں کما حقہٗ منتقل کرنا ''کارِ دارد'' کا حکم رکھتا ہے۔

لسانی گروہوں اور جغرافیائی وحدتوں کے لیے علاحدہ علاحدہ زبانیں ہیں۔ ایک زبان کے جاننے والوں کے لیے دوسری زبان سے واقفیت ممکن نہیں رہی۔ جس طرح جذبات، احساسات اور تجربوں کا اظہار کسی ایک زبان میں

تقریر وتحریر کے ذریعے ہوتا ہے اسی طرح اس اظہار کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کی ضرورت بھی پیش آنے لگی۔ اس منتقلی کا نام ترجمہ ہے۔ گویا ترجمہ راست اظہار نہیں ہوتا بل کہ اصل اظہار کا عکس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمہ عام طور پر اصل سے کم تر ہوگا۔ ترجمہ اصل کے برابر اس لیے بھی نہیں ہوسکتا کہ ہر انفرادی لفظ تاریخ کی دین ہوتا ہے اور اس کا اپنا تہذیبی پس منظر ہوتا ہے۔

اردو ادب میں باقاعدہ شعری ترجمے کا آغاز گولکنڈہ کے فرمان روا محمد قلی قطب شاہ کے عہد (۱۵۸۰۔۱۶۱۱) اور اس کی شاعری سے ہوتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں دکنی ادیبوں اور شعرا کا فارسی کی طرف زیادہ رجحان تھا جس کے نتیجے میں اس عہد میں ترجمے پر بھی باقاعدہ توجہ دی گئی۔ جمیل جالبی کے مطابق قلی قطب شاہ نے حافظؔ کی غزلیں اردو میں ترجمہ کی ہیں۔ اسی عہد میں شیخ احمد گجراتی نے مولانا جامیؔ اور امیر خسروؔ کی فارسی مثنویوں ''یوسف زلیخا'' کا ترجمہ اسی عنوان سے مثنوی کی صورت میں سن ۱۵۸۰ء سے ۱۵۸۸ء کے درمیان میں کیا ہے۔ ۱۶۳۱ء میں غواصیؔ نے ''ہتوپدیش'' کے بخشیؔ کے فارسی ترجمے ''طوطی نامے'' کا اسی عنوان سے اردو میں ترجمہ کیا۔ ۱۶۴۰ء میں بیجاپور کے سلطان محمد عادل شاہ کی فرمائش پر ملکؔ خوشنود نے فارسی مثنوی ''یوسف زلیخا'' اور امیر خسروؔ کی مثنوی ''ہشت بہشت'' کا ترجمہ ''جنت سنگھار'' کے عنوان سے کیا۔ ۱۶۴۰ء میں کمال خاں رستمی کا ترجمہ ''خاور نامہ'' جو اردو کی سب سے طویل مثنوی ہے جو ۲۴ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ مثنوی اردو کے شعری تراجم میں بہت اہم اور اصل کے مطابق ہے۔

۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کے قیام کے بعد اردو میں مغرب کے تخلیقی ادب کے تراجم کا آغاز ہوا۔ اردو میں باقاعدہ اینتھولوجی انتخاب کا آغاز ضامن کنتوری کی کتاب ''ارمغان فرنگ'' سے ہوا جو ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔ بیسویں صدی میں انگریزی کے ساتھ مغرب کی دوسری زبانوں کے شعر و ادب کے ترجمے پر بھی زیادہ توجہ دی گئی۔ بیسویں صدی میں معنی و خیال پر زیادہ زور دینے کی وجہ سے بیشتر انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں کی شاعری کا ترجمہ نثر میں کیا گیا۔ نظم کی اس قلب ماہیت کے باوجود شعری تاثر کافی حد تک قائم رہتا ہے۔

7.5 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ منظوم ترجمہ کیا ہے۔ وضاحت کیجئے۔

2۔ منظوم ترجمے میں پیش آنے والے مسائل پر بحث کیجئے

3۔ اردو میں منظوم ترجمے کی روایت پر روشنی ڈالئے

4۔ منظوم ترجمے کی اہمیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیجئے

7.6 امدادی کتب

1۔ اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، از اعجاز راہی

2۔ اردو شاعری میں گیتا نجلی، از انور جلال پوری

3۔ فن ترجمہ نگاری، از مرتبہ خلیق انجم

4۔ اردو میں ترجمے کی روایت، از مرزا حامد بیگ

اکائی نمبر8: نثری ترجمہ

ساخت

8.1 تمہید
8.2 مقاصد
8.3 نثری ترجمہ
8.4 عمومی جائزہ
8.5 سوالات
8.6 امدادی کتب

8.1 تمہید

نثری ادب کے ترجمے میں جن اصول ولوازم کی اہمیت ہے ان میں پہلا مرحلہ زبان کا ہے۔مترجم کوتصنیف اورترجمے دونوں کی زبان سے پوری طرح واقف ہونا چاہئے ۔نثری ادب پارے کی زبان علمی کتابوں کی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ادبی تصانیف کی زبان راست اظہار کی متحمل نہیں ہوسکتی۔اس میں فکروجذبے کی آمیزش کے ساتھ جمالیاتی کیفیت وانبساط کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔مختلف تہذیبی حوالے،لفظی ومعنوی تہہ داریاں،فکروخیال کی نزاکت ونفاست اورجذبہ واحساس کی پیدا کردہ تاثراتی فضاادبی نثر کا جوہر ہوتے ہیں۔مترجم کواس ادبی زبان کی متذکرہ بالاتمام خوبیوں کوترجمے کی زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔اس لئے اسے تصنیف اورترجمہ دونوں کی زبانوں کے استعاراتی وہ تشبیہاتی نظام،تہذیبی اصطلاحات، ضرب الامثال اورروزمرہ سے گہری واقفیت ہونی چاہئے۔

نثری ادب پارے کے ترجمے کے سلسلے میں مترجم کو ایک اور اہم نکتے پر توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔ اسے نثری ادب پارے کے مرکزی خیال، مجموعی تاثر، الفاظ کی نشست و برخاست کی پیدا کردہ تاثراتی فضا کا عرفان و ادراک ہونا چاہئے۔ چونکہ ادبی نثر میں لفظ صرف خیال یا جذبات کی ترسیل کے لئے ہی نہیں استعمال کیا جاتا بلکہ کسی مخصوص فضا کا اظہار بھی ادیب کا مقصد ہوتا ہے۔

مترجم کی کوشش ہونی چاہئے کہ ترجمے کے عمل میں فضا سازی کا وہ وصف فراموش نہ کرے جو نثری ادب پارے کے مصنف کے تخلیقی عمل کا حصہ رہا ہو۔ کامیاب مترجم وہی ہے جو نہ صرف الفاظ کا ترجمہ کرتا ہے بلکہ ادب پارے کی تاثراتی فضا کو بھی ترجمے میں برقرار رکھتا ہے۔ اگر نثری تصنیف کسی دوسرے علم کی کتاب ہے تو اس سے واقفیت ضروری ہے ظاہر بات ہے کہ ترجمہ نگار اگر اس مخصوص علم سے واقف نہ ہو تو اس کے لئے عبارت کو ترجمہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ نثری تصنیف خواہ ادبی ہو یا دوسرے علوم سے متعلق دونوں کا ترجمہ چند مخصوص تقاضے رکھتا ہے، جنہیں پورا کرنا مترجم کے لئے ضروری ہے۔ اس مرحلے پر مترجم کا وسیع مطالعہ، اعلیٰ ذوق اور بلند تخیل ہی کام آ سکتا ہے۔

8.2 مقاصد

نثری ترجمہ اور اس کی اہمیت و افادیت پر اس اکائی میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اردو میں نثری ترجمے کی روایت، اصول اور مسائل پر بھی مفصل بحث کی گئی ہے۔ نثری ترجمہ کرتے وقت فن ترجمہ نگاری کے کن اصولوں کو بروئے کار لایا جاتا ہے اور مترجم کو کن مسائل کا سامنا رہتا ہے۔ نثری ترجمے کی ضرورت اور اہمیت کیا ہے اور اردو میں اس کی روایت کب اور کس عہد میں ہوئی۔ ان ہی مذکورہ نکات پر بحث کرنا اس اکائی کا اہم مقصد ہے۔

8.3 نثری ترجمہ

دنیا کی بیشتر زبانوں کے ادب میں تراجم کی رویت موجود ہے۔اردو زبان کا دامن بھی تراجم سے مالا مال ہے۔ اردو کے ابتدائی شعری ونثری ادب کی بنیاد زیادہ تر تراجم پر قائم ہے۔شاعری میں قدیم دکنی مثنویوں کا پلاٹ فارسی یا عربی سے لیا گیا۔نثری ادب میں ابتدائی اردو قصے بھی فارسی وعربی کی وساطت سے اردو میں آئے۔اردو تراجم کی روایت زیادہ پرانی نہیں ہے۔نثری تراجم کا آغاز سترہویں صدی عیسوی کے آغاز سے ہوتا ہے۔عام طور پر سترہویں صدی میں ملا وجہی کی ''سب رس'' (۱۶۳۵ء) کو سب سے پہلی ترجمہ شدہ کتاب تصور کیا جاتا ہے۔مگر تحقیقی اعتبار سے شاہ میراں جی خدانما (دکن) سب سے پہلے مترجم قرار پائے۔جن کا تعلق قطب شاہی عہد سے تھا۔شاہ میراں جی نے عربی زبان کے مشہور مصنف ابوالفضل عبداللہ بن محمد عین القضات ہمدانی کی تصنیف ''تمہیدات عین القضات'' کا اردو ترجمہ کیا۔اس ترجمے کا ایک نسخہ ۱۶۰۳ء میں لکھا گیا۔جو نسخہ مولوی عبدالحق کے پاس ہے۔اس پر سنہ کتابت ۱۰۶۷ھ درج ہے۔

اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اردو میں نثری تراجم کی روایت منظوم تراجم سے پہلے قائم ہوئی۔شاہ میراں جی خدانما کے بعد قطب شاہی دور ہی کے ممتاز شاعر اور نثر نگار ملا وجہی کا نام قابل ذکر ہے۔ملا وجہی نے شاہ کی نیشاپوری کی فارسی تصنیف 'دستورِ عُشاق، کا اردو ترجمہ ۱۶۳۵ء میں 'سب رس' کے نام سے کیا۔سب رس کے بعد اسی دور میں میراں یعقوب نے رکن عماد الدین دبیر کی کتاب ''شمائل الاتقیاء'' کا اردو ترجمہ ۱۶۷۳ء میں مکمل کیا۔

قطب شاہی دور کے بعد اٹھارویں صدی عیسوی میں دکن میں مغلیہ دور میں شاہ ولی اللہ قادری نے ۱۷۰۴ء میں شیخ محمود کی فارسی تصنیف 'معرفت السلوک' کا اردو ترجمہ کیا۔شمالی ہند میں بھی تراجم کا کام جاری تھا۔فضل علی فضلی کی 'کربل کتھا' ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی کتاب ''روضتہ الشہداء' کا اردو ترجمہ یہ۔یہ ترجمہ ۱۷۳۱ء میں کیا گیا۔شمالی ہند میں اردو ترجمہ کے حوالے سے دوسرا اہم کام مولانا شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے قرآن پاک کے اردو تراجم ہیں۔ان تراجم کے بعد اس زمانے کی ترجمہ شدہ کتاب میر عطا حسین تحسین کی ''نوطرز مرصع'' ہے جو کہ فارسی قصہ چہار

درویش کا ترجمہ ے۔ یہ کتاب ۱۷۹۸ء میں مکمل ہوئی۔

فارسی، عربی اور سنسکرت سے اردو تراجم کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان سے اردو تراجم کا سراغ بھی اٹھارویں صدی عیسوی سے ملتا ہے۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے کے تراجم انفراد کوشش کی ذیل میں آتے ہیں۔ لیکن فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ساتھ ہی مجموعی انداز میں باقاعدہ تراجم کا آغاز ہوا۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر گل کرائسٹ نے ملک کے تمام ذی علم اشخاص کو جمع کیا اور ان سے آسان اردو میں کتابیں لکھوائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ گل کرائسٹ نے دوسری زبانوں کی شاہکار کتابوں کے اردو تراجم بھی کرائے۔ ان مصنّفین و مترجمین میں ''میر امن دہلوی'' حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، میر بہادر علی حسینی، مظہر علی خان ولا، مولوی امانت اللہ، شیخ حفیظ الدین، خلیل علی خان اشک، نہال چند لاہوری اور مرزا جان طپش وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اردو تراجم کے سلسلے میں سر سید احمد خان اور ان کے رفقا کی کوششوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سر سید احمد خان کی یہ دیرینہ خواہش تھی کہ مسلمان سائنس کی تعلیم میں کسی سے پیچھے نہ رہیں، چناں چہ اس کے لئے انہوں نے ۱۸۶۲ء میں ایک سائنٹفک سوسائٹی قائم کی، جس نے زیادہ تر سائنسی موضوعات اور ساتھ ہی دیگر علوم پر مبنی انگریزی کتب کے اردو تراجم کرائے۔ اس سوسائٹی کے تحت تقریباً ۴۰ کتب کا ترجمہ ہوا۔ اس سلسلے کی ایک اور منظّم کوشش ''انجمن ترقی اردو ہند'' کی شکل میں سامنے آئی۔ یہ انجمن ۱۹۰۳ء میں قائم ہوئی۔ اس انجمن کے تحت انگریزی اور عربی کتب کے متعدد ترجمے اردو میں ہوئے۔ انجمن ترقی اردو کی کوششیں اپنی جگہ جاری تھیں کہ مولانا شبلی نے ۱۹۱۳ء میں اعظم گڑھ میں ''دار المصنّفین'' قائم کی، جس نے مشرقی علوم و فنون کے ساتھ ساتھ مغربی فلسفیوں اور ماہرین نفسیات کی بعض اعلیٰ تصانیف کے اردو تراجم کرائے۔ دار المصنّفین کے تراجم میں 'روح الاجتماع، انقلاب الاسم، مبادی علم انسانی، مکالمات برکلے، فطرت نسوانی اور افکار عصریہ قابل ذکر ہیں۔

۱۹۱۷ء میں جامعہ عثمانی کا قیام عمل میں آیا، جس کے شعبۂ تالیف و ترجمہ سے ترجمہ کی روایت آگے بڑھی۔ مولوی عبدالحق اس کے ناظم مقرر ہوئے۔ دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ نے بہت سی مغربی و مشرقی کتب کے تراجم اردو میں کرائے

اوراس طرح کیمیا، طبیعات، حیاتیات اور انجینئرنگ وغیرہ کے مضامین اردو تراجم میں داخل ہوئے اور اردو زبان کی وسعت اور توانائی کا وسیلہ بنے۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانی میں ترجمہ کا کام فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج اور سائنٹفک سوسائٹی کے مقابلے میں زیادہ بڑے پیمانے پر ہوا۔ دارالترجمہ کی کوششوں سے اردو میں بے شمار نئے الفاظ اور نئی اصطلاحات کا اضافہ ہوا۔ بقول میر حسن:

> ''دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کا قیام اردو زبان کو علوم وفنون سے مالا مال کرنے کی پہلی باقاعدہ اور مستقل کوشش ہے جو بڑے پیمانے پر کی جارہی ہے۔ درالترجمہ کی مطبوعات نے اردو میں غیر معمولی وسعت پیدا کردی، جدید علوم وفنون کا کافی ذخیرہ اردو میں منتقل کردیا اور علمی خیالات کے اظہار کے لئے گنجائش پیدا کردی۔ اردو کے ذخیرہ الفاظ میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے''

انگریزی تصانیف کے اردو تراجم، ص ۱۱۷

۱۹۲۷ء میں قائم شدہ ہندوستانی اکیڈمی اور اردو اکیڈمی نے اردو ترجمے کو آگے بڑھایا۔ ہندوستانی اکیڈمی نے جرمن ڈرامہ نویس لیسنگ کے ناول 'ناتن' اور انگریزی کے ڈرامہ نگار گالزوردی کے ناول کو اردو میں منتقل کیا۔ بیسویں صدی 'ناتن' اور انگریزی کے ڈرامہ نگار گالزوردی کے ناول کو اردو میں منتقل کیا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں مذکورہ بالا تنظیموں کے علاوہ انفرادی طور پر بھی اردو تراجم کا سلسلہ جاری رہا۔ مغربی زبانوں کے ناول، افسانہ اور ڈرامہ وغیرہ کو اردو تراجم کا جامہ پہنایا گیا۔ اردو ترجمے کا دائرہ یوں وسیع ہوتا گیا اور عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی کے علاوہ فرانسیسی، روسی، ترکی اور جرمن وغیرہ کے تراجم بھی اردو میں ہونے لگے۔

8.4 عمومی جائزہ

نثری ادب کے ترجمے میں جن اصول ولوازم کی اہمیت ہے ان میں پہلا مرحلہ زبان کا ہے۔ مترجم کو تصنیف اور ترجمے دونوں کی زبان سے پوری طرح واقف ہونا چاہئے ۔نثری ادب پارے کی زبان علمی کتابوں کی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ ادبی تصانیف کی زبان راست اظہار کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اس میں فکر وجذبے کی آمیزش کے ساتھ جمالیاتی کیفیت وانبساط کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ مختلف تہذیبی حوالے، لفظی ومعنوی تہہ داریاں، فکر وخیال کی نزاکت ونفاست اور جذبہ واحساس کی پیدا کردہ تاثراتی فضا ادبی نثر کا جوہر ہوتے ہیں۔ مترجم کو اس ادبی زبان کی متذکرہ بالا تمام خوبیوں کو ترجمے کی زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے اسے تصنیف اور ترجمہ دونوں کی زبانوں کے استعاراتی وہ تشبیہاتی نظام، تہذیبی اصطلاحات، ضرب الامثال اور روزمرہ سے گہری واقفیت ہونی چاہئے۔

نثری ادب پارے کے ترجمے کے سلسلے میں مترجم کو ایک اور اہم نکتے پر توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔ اسے نثری ادب پارے کے مرکزی خیال، مجموعی تاثر، الفاظ کی نشست وبرخاست کی پیدا کردہ تاثراتی فضا کا عرفان وادراک ہونا چاہئے۔ چونکہ ادبی نثر میں لفظ صرف خیال یا جذبات کی ترسیل کے لئے ہی نہیں استعمال کیا جاتا بلکہ کسی مخصوص فضا کا اظہار بھی ادیب کا مقصد ہوتا ہے۔

مترجم کی کوشش ہونی چاہئے کہ ترجمے کے عمل میں فضا سازی کا وہ وصف فراموش نہ کرے جو نثری ادب پارے کے مصنف کے تخلیقی عمل کا حصہ رہا ہو۔ کامیاب مترجم وہی ہے جو نہ صرف الفاظ کا ترجمہ کرتا ہے بلکہ ادب پارے کی تاثراتی فضا کو بھی ترجمے میں برقرار رکھتا ہے۔ اگر نثری تصنیف کسی دوسرے علم کی کتاب ہے تو اس سے واقفیت ضروری ہے ظاہر بات ہے کہ ترجمہ نگار اگر اس مخصوص علم سے واقف نہ ہو تو اس کے لئے عبارت کو ترجمہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ نثری تصنیف خواہ ادبی ہو یا دوسرے علوم سے متعلق دونوں کا ترجمہ چند مخصوص تقاضے رکھتا ہے، جنہیں پورا کرنا مترجم کے لئے ضروری ہے۔ اس مرحلے پر مترجم کا وسیع مطالعہ، اعلیٰ ذوق اور بلند تخیل ہی کام آسکتا ہے۔

اردو میں ترجموں کا سب سے کثیر سرمایہ افسانوی ادب میں ملتا ہے۔ معروف نقاد احتشام حسین اردو میں افسانوی ادب کے تراجم سے متعلق اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ افسانوی ادب کے تراجم اردو میں رسالوں اور اخباروں کا پیٹ بھرنے کے لئے ہوئے ۔یعنی رسالوں اور اخباروں کو چھاپنے کے مواد تو چاہئے ہی تھا اور ادیبوں سے طبع زاد تحریریں تخلیق کرانے کے مقابلے میں ترجمے کرالینا قدرے آسان کام تھا، اسی لئے اردو میں بھی مختصر افسانے شروع میں اخبارات کی زینت بنے۔ لاہور سے نکلنے والے مخزن، کانپور کے زمانے، آگرہ کے نگار اور دہلی کے صلائے عام رسالے یورپی افسانوں کے ترجمے چھاپتے تھے۔ ان ترجموں کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ ان کی بدولت اردو کے ادیب افسانہ نگاری کی طرف تیزی سے مائل ہوئے۔ البتہ اس دور کے ترجموں کی خرابی یہ ہے کہ اشاعت کے وقت ان میں اس بات کو ملحوظ نہیں رکھا گیا کہ اصل مصنف کون ہے، کس زبان کا ہے، یا مترجم کون ہے، کون سا افسانہ اصل کے مطابق ہے، کون سا محض ماخوذ ہے وغیرہ۔

اس دور کے تراجم سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ چیخوف اور فرانسیسی ادیب موپاساں کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ سعادت حسن منٹو نے بھی ابتداء میں افسانوں کا ترجمہ کیا اور اپنے تراجم کا مجموعہ روسی ادب کے عنوان سے لاہور سے شائع کرایا۔ ہندوستان میں بیسویں صدی کے نصف اول میں جس طرح کی عوامی بیداری کی لہر تھی اور سیاسی تحریکات پنپ رہی تھیں ان کے سبب معاشرے کا ایک خاص مزاج بن گیا تھا۔ روسی ادب اس مزاج سے خاصا میل کھاتا تھا۔ اسی لئے اس دور میں روسی ناولوں، ڈراموں اور افسانوں کے خوب ترجمے ہوئے۔ دیگر اہم زبانیں جن سے اردو میں ترجمے ہوئے چینی، عربی، ترکی، فارسی، اور اسپینی ہیں۔ افریقی اور لیٹن امریکی ادب کا بھی خاصا ترجمہ ہوا ہے جو عموماً انگریزی اور اسپینی زبانوں کی مدد سے ہوا۔

8.5 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ نثری تراجم کے اصول ومسائل پر بحث کیجئے۔

2۔ اردو میں نثری ترجمے کی روایت پر روشنی ڈالئے۔

3۔ ادبی اداروں میں ہوئے نثری تراجم کا جائزہ لیجئے۔

8.6 امدادی کتب

1۔ مغرب سے نثری تراجم، از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

2۔ اردو میں ترجمے کی روایت، از قمر رئیس

3۔ ترجمے کا فن (نظری مباحث)، از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

اکائی نمبر9: نثری اور منظوم ترجمے میں فرق

ساخت:

9.1 تمہید

9.2 مقاصد

9.3 نثری اور منظوم ترجمے میں فرق

9.4 عمومی جائزہ

9.5 سوالات

9.6 امدادی کتب

9.1 مقاصد

نثری اور منظوم ترجمے کے اصولوں اور تقاضوں میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ سب سے بڑی شرط دونوں زبانوں کو جاننے کی ہے جو نثری اور منظوم دونوں ترجموں کے لئے ضروری ہے۔ ترجمے اور تصنیف کی زبانوں کے ذخیرہ الفاظ پر قدرت اور ان زبانوں کے تہذیبی پس منظر سے آگاہی اور محاروات وضرب الامثال سے واقفیت دونوں طرح کے ترجموں کے لئے ضروری ہے۔ تاہم ان دونوں قسم کے ترجموں میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ منظوم ترجمے کرنے والے مترجم کو موزوں طبع ہونا چاہئے اور ان دونوں زبانوں کے شعری سرمائے پر نہ صرف یہ کہ اس کی گہری نظر ہو بلکہ وہ دونوں زبانوں کے شعری تلازمات اور تشبیہی واستعاراتی نظام سے بخوبی واقف ہو۔ ترجموں کی ساخت اور مکالموں کی زبان نیز لب ولہجہ کا خیال رکھنا نثری ترجمے کا اہم تقاضا ہے۔ نثری تصانیف میں مترجم کو صرف مصنف کی ہی زبان سے سابقہ نہیں

پڑے گا بلکہ ان کو ناول، افسانے، داستان اور ڈرامے کے کرداروں کی زبان کو بھی اس کے تمام تر تہذیبی وسماجی حوالوں کے ساتھ سمجھنا پڑے گا۔ اسی طرح اسے نئے الفاظ ڈھالنے کے لئے اپنے زبان کے مزاج اور صوتی نظام سے بھی واقف ہونا ضروری ہے۔ منظوم ترجمے میں اسے ایسی کسی صورت حال کا سامنا نہیں ہوتا۔ منظوم ترجمے میں مصنف کی ہیئت یا فارم کا بھی انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ جس شعری تخلیق کا وہ ترجمہ کر رہا ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ جس فارم میں ہو وہ فارم ترجمے کی زبان میں بھی موجود ہو۔ ایسے موقع پر مترجم کو ترجمے کی زبان میں اسی ہی شعری صنف کا انتخاب کرنا پڑتا ہے جو طرز ادا، موضوع اور فارم کے لحاظ سے شعری تخلیق سے قریب تر ہو۔ نثری ترجمے میں اس طرح کی وقت کم پیش آتی ہے۔ ان چند نکات کے علاوہ نثری اور منظوم ترجمے کے تقاضے تقریباً یکساں ہیں۔

9.2 مقاصد

اس اکائی میں نثری اور منظوم ترجمے اور اس کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ نثری اور منظوم ترجمے کے کیا مسائل اور تقاضے ہیں، ان دونوں میں سے کون سا ترجمہ مشکل ہے اور کون سے قدرے آسان سے اس کی وضاحت تفصیل سے کی گئی ہے۔ نثری اور منظوم ترجمہ کرتے وقت مترجم کو کن اصولوں اور تقاضوں کو مدنظر رکھنا ہوتا ہے اور اُسے کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے ان سب کی تفصیلی بحث اس اکائی کا مقصد ہے۔ نثری اور منظوم ترجمہ دو مختلف چیزیں ہیں ان کے مسائل اور تقاضے بھی مختلف ہیں۔ مترجم کو نثری اور منظوم ترجمہ کے لئے بنائے گئے اصول اور اختراع کی گئی اصطلاحات وغیرہ کا پاس رکھنا کیوں ضروری ہے۔ شعری ترجمے کی کیا مشکلات ہیں؟ کیا شعری ترجمہ کہا جاسکتا ہے یا نہیں اس باتوں کا جائزہ اس اکائی میں لیا گیا ہے۔

9.3 نثری اور منظوم ترجمے میں فرق

ترجمہ ایک زبان سے دوسرے زبان میں الفاظ و مفہوم کی تبدیلی کا نام ہے تاہم یہ تبدیلی اتنی آسان نہیں اس

لئے کہ ہر زبان کسی نہ کسی معنوں میں دوسری زبان سے مختلف ہوتی ہے۔محاورے،ضرب الامثال، کہاوتیں،صنائع بدائع ضروری نہیں کہ ہر زبان میں یکساں ہوں۔ پھر نثر سے بڑھ کر شاعری کا ترجمہ اور پھر وہ بھی منظوم ترجمہ تو اور زیادہ دقتوں کا حامل ہوتا ہے، یہ گویا لوہے کے چنے چبانے کے برابر ہے۔ چونکہ شاعری ایک فن لطیف ہے اور یہ فن ایسی نزاکت بھری اصناف سے بھرا پڑا ہے۔جن کا ہو بہو بدل دوسری زبانوں میں ملنا مشکل ہے اسی لئے شاعری کے ترجمہ کو سب سے مشکل مانا جاتا ہے۔اصناف کے علاوہ شاعری کے موضوعات اور تقاضے بھی جدا جدا ہوتے ہیں جن کا منظوم ترجمہ میں اہتمام مشکل ہوتا ہے مثلاً اردو زبان میں غزل، مرثیہ اور ریختی جیسی اصناف ہیں۔انگریزی یا جرمن زبان میں ان کا وجود نہیں ہے۔اس لئے ان زبانوں میں ان اصناف کا کامیاب ترجمہ کرنا بہت مشکل ہوگا۔اس کے علاوہ ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ ہر زبان کی شاعری میں زبان کی باریکیوں اور اس کی تہذیب کی نزاکتوں کا گہرا اثر ہوتا ہے اور ان کا استعمال ہوتا ہے جو استعاروں، کنایوں، تلمیحات اور شعری صنعتوں کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ان کے وسیلہ سے ہی شاعر اپنے کلام میں شعریت، معنویت اور تاثیر پیدا کرتا ہے اور یہ ایک انتہائی صبر آزما کام ہے۔

چنانچہ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔مثلاً مشہور فرانسیسی شاعر پال دلیری نے مشورہ دیا کہ مترجم بھی ٹھیک اسی طرح سے تخلیق کے عمل سے گذرنے کی کوشش کرے جس سے اصل شاعر گزرا ہے۔وہ کہتا ہے کہ

> To translate is to reconstitute as nearly as possible, the effect of a certain cause (The Original) by means of another cause (The translation)

ترجمہ: ''ترجمہ کرنا کسی علت (اصل تخلیق) کے معلول کی ایک دوسری

علت (ترجمہ) کے توسط سے امکانی قربت (صحت) کے ساتھ تشکیل نو
کرنا ہے''۔

یعنی شاعر نظم کے مطالعہ سے پیدا ہونے والے ذہنی تاثر کو اپنے الفاظ میں بیان کرے یا نظم کے اس خیال کو اپنی زبان میں اس طرح بیان کرے کہ اس کا معنوی اور جمالیاتی تاثر قاری تک منتقل ہو اور یہ ایک نئی تخلیق ہوگی نہ کہ صرف الفاظ کی منتقلی۔ گویا نظم کا ترجمہ ایک تخلیقی ترجمہ ہوگا۔ تاہم یہ ایک انتہائی مثالی صورتحال ہے اور تقریباً ناممکن ہے۔ اس لئے کہ ہر شعر کے کئی معنیٰ و مفہوم ہوتے ہیں اور ضروری نہیں کہ مترجم بھی اس کے ٹھیک وہی معنی لے جو شاعر بیان کرنا چاہتا ہو۔ ظاہر ہے کہ خود شاعر کے مقصود تک پہنچنا بہت مشکل ہے اسی لئے تو ایک شاعر کی تخلیقات کی کئی کئی تشریحات لکھی جاتی ہیں۔ چنانچہ مترجم سے اس بات کا مطالبہ کہ وہ ٹھیک ٹھیک مدعا تک پہنچے ایک زیادتی ہوگی۔ اس کے علاوہ ہر زمانہ کے لوگ اشعار کو اپنی فکر کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے ایک شعر کے کئی کئی مفاہیم رائج ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ اب یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ مترجم کیا سبھی مفاہیم کا ترجمہ کرے یا صرف ایک کا۔ اگر مترجم صرف ایک مفہوم کا ترجمہ کرے تو کس مفہوم کو ترجیح دے اور یہ ضروری نہیں کہ مترجم نے جس مفہوم کو ترجیح کے لئے ترجیح دی ہے وہ صحیح یا زیادہ لوگوں کے لئے قابل قبول ہو۔

ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ منظوم ترجمہ ٹھیک اسی صنف اور ہیئت میں ہو جو اصل زبان میں ہے یا اس کو بدلنے کی آزادی ہے، وہ پابند ہو یا آزاد، صرف تاثر کی منتقلی مطلوب ہے یا زبان کی پیچیدگیاں اور نزاکتوں کو بھی منتقل کرنا ہوگا وغیرہ۔ چنانچہ ایک ترکیب یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ نظم کا ترجمہ نثری ہی میں کر دیا جائے تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری جب منظوم ترجمہ ہی نہ ہوگا تو اس کے مسائل بھی نہ ابھریں گے۔

ماہرین کے مطابق منظوم ترجمے کو کئی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ لفظی ترجمہ، آزاد ترجمہ، ماخوذ ترجمہ اور تخلیقی ترجمہ، محض لفظی منظوم ترجمہ ہر قسم کی تخلیقی خصوصیات سے محروم ہوتا ہے اور مکھی پر مکھی بٹھانے کا کام کیا جاتا ہے۔

آزاد ترجمہ میں شعری تخلیق کے مرکزی خیال اور مجموعی تاثراتی فضا کو برقرار رکھتے ہوئے ترجمے کا فریضہ انجام دیا جاتا ہے۔اس طرح کے ترجمے میں بڑی حد تک ترجمے کی زبان کے شعری لوازم سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ ماخوذ ترجمہ بھی اس سے قریب ہوتا ہے اس میں بھی اصل شعری تخلیق سے مرکزی خیال اخذ کیا جاتا ہے، لیکن شاعر اپنے افکار وخیالات اور اپنے تجربات بھی اس میں شامل کرتا ہے لیکن تخلیق کے مرکزی خیال کو باقی رکھ کر۔منظوم ترجمے کی سب سے ارفع واعلیٰ شکل تخلیقی ترجمہ ہے۔اس میں مترجم شاعر کے جذبات ،احساسات اور کیفیات وتاثرات کو اپنے دل ودماغ پر اس طرح طاری کر لیتا ہے کہ وہ اس کے تخلیقی عمل کا حصہ بن جائے پھر اپنی زبان میں اسے اسی طرح پیش کرتا ہے کہ اس کی حیثیت بازتخلیقی ہو جاتی ہے۔

چند دانشوروں کا ماننا ہے کہ اگر نظم کا ترجمہ نثر میں کیا جائے تو کچھ حد تک قابل برداشت ہوتا ہے اگر نظم کا ترجمہ نظم میں کیا جائے تو اصل نظم کے ساتھ سخت ناانصافی ہے، کیونکہ اس طرح کے ترجموں میں اصل متن میں شاعر کچھ کہتا ہے اور مترجم کچھ اور ترجمہ کرتا ہے۔نظم میں عام طور سے ایسا ہوتا ہے کہ شاعر اپنے خیال کو شعر کے سانچے میں اس طرح ڈھالتا ہے کہ شعر کے ایک سے زیادہ مفہوم ہو جاتے ہیں اس لئے شاعروں کے کلام کی شرح لکھی جاتی ہے۔چنانچہ اگر نظم کا ترجمہ کرنا ہی ضروری ہے تو نثر میں ترجمہ کرنا بہتر ہوگا۔

تاہم میرا خیال ہے کہ یہ ایک دشوار ترین امر ہے۔شاعری کا ترجمہ منظوم یعنی شاعری ہی میں ہو تو بہتر ہے اس لئے کہ شاعری سے وابستہ لسانی خصوصیات ،اس کا کیف وانبساط ،اس کی چاشنی صرف شاعری ہی میں منتقل ہو سکتی ہے اور نثری ترجمہ شاعری پر ظلم کے برابر ہے۔شعر کی تاثیر شعر ہی میں آسکتی ہے، نثر میں نہیں۔ہاں یہ اور بات ہے کہ مترجم کو اس سلسلے میں تھوڑی آزادی ہونی چاہئے کہ وہ ادبی اصناف کی دستیابی ،اشعار کے وزن وغیرہ کو دیکھ کر اس میں کچھ تبدیلی کرے لیکن یہ تبدیلی صرف ہیئت میں ہو نہ کہ مفہوم میں۔

اس کے لئے ایک باوق مترجم کی ضرورت پڑتی ہے۔ایسا مترجم جو اپنی پسندیدہ چیزوں کو لوگوں تک پہنچانے

کے لئے بے تاب ہو۔ اگر اسے کوئی نظم پسند آئے اور وہ اس سے متاثر ہو تو فوری وہ چاہے کہ دیگر لوگ بھی اس سے اسی چاشنی کے ساتھ مستفید ہوں جس کے ساتھ وہ ہوا ہے اور اس نظم کو وہ الفاظ کا نیا جامہ پہنا کر لوگوں کے سامنے رکھے اور جب قاری اس ترجمہ شدہ نظم کو پڑھے تو وہ بھی اصل شاعر کے خیالات تک پہنچے۔ مترجم کو اصل شاعر اور قاری کے درمیان حائل ہونے سے حتی الامکان بچنا چاہئے اس لئے کہ وہ نظم دراصل شاعر کے خیالات اور تجربہ کی عکاس ہے جو کہ ہو بہو مترجم کے خیالات اور تجربہ سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ ان مسائل کی بنا پر بعض دانشوروں کا خیال ہے کہ نظم کا منظوم ترجمہ بڑی حد تک دشوار ہے۔ انگریزی کا مشہور نقاد جانسن تو یہاں تک کہتا ہے کہ ''نظم کا ترجمہ تو ہو ہی نہیں سکتا'' اور وکٹر ہیوگو کی نظر میں تو نظم کے ترجمہ کا خیال ہی بے معنی اور ناممکن ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور بات یہ کہ نثر کا اسلوب ترسیلی اور وضاحتی ہوتا ہے جب کہ شاعر اشاروں اور علامتوں کی زبان میں بات کرتا ہے پھر شاعری میں وزن، قافیہ وردیف کا بھی التزام ہوتا ہے۔ شعر کی یہی مجموعی ہیئت اس کی اثر آفرینی اور وجدانی تجربے کا باعث ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے شاعری کا ترجمہ انتہائی مشکل اور پیچیدہ عمل ہے۔ شاعری کے ترجمے کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ترجمے کے بعد بھی شاعری رہے۔ عجیب قسم کا نثری نمونہ نہ بن جائے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ نظم کا ترجمہ نظم میں ہی ہونا چاہئے۔ نثری ترجمے سے اس کا شعری لطف زائل ہو جاتا ہے چوں کہ ہر زبان کا عروضی اور صوتی نظام جدا ہوتا ہے اور مختلف اثرات کا حامل ہوتا ہے اس لئے شعر کی اصلی کیفیت کا ترجمہ ناممکن ہے۔

نثری ترجمے کے مقابلے میں منظوم ترجمے کی مشکلات زیادہ ہیں۔ ذیل میں منظوم ترجمے میں پیش آنے والی مشکلات پر گفتگو کی جارہی ہے۔ طبعی علوم کے علاوہ ہر علم کی اصطلاحیں آہنی سانچے کی طرح قطعی نہیں ہوتیں۔ یہی نہیں زیادہ لفظ ایسے ہیں جن کے ایک سے زیادہ معنی ہوتے ہیں اور بعض وقت ایک ہی لفظ کے دو متضاد معنی بھی ہوتے ہیں۔ شروع میں ایک لفظ کا ایک ہی مفہوم رہا ہوگا۔ وہ بنیادی معنی آج بھی لغوی معنی ہیں لیکن ہر لفظ کے لغوی معنی کے علاوہ

اصطلاحی معنی بھی ہوتے ہیں اوران میں وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ دشواری سائنسی علوم کے سلسلے میں ہی نہیں ادب اور خاص طور سے شاعری کے سلسلہ میں بھی پیش آتی ہے۔ ذو معنی الفاظ ہی کی وجہ سے نہیں مضارع کے استعمال کی وجہ سے بھی دقت پیدا ہوجاتی ہے۔اگر ایک شعر کے دو یا دو سے زیادہ معنی ایہام یا لہجے کی وجہ سے ہوں کہ یک لہجے میں پڑھنے سے شعر کے ایک معنی اور دوسرے لہجے میں پڑھنے سے دوسرے معنی ہوں تو ظاہر ہے ترجمہ کی ادائیگی کے راستے میں دیوار کھڑی ہوجاتی ہے۔ف۔س۔اعجاز اپنے مضمون ''شاعری کا ترجمہ چند عملی مسائل'' میں لکھتے ہیں۔

> ''ترجمہ ایک مشکل فن ہے۔ شاعری کا ترجمہ، وہ بھی شاعری میں، خصوصا زیادہ مشکل کام ہے۔اگر یہ کام آسان ہوتا تو جتنی انگریزی نظمیں اب تک مجھے پسند آئیں۔ میں نے اس سب کا اردو ترجمہ کرلیا ہوتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ جس ادب پارے کو میں نے پسند کیا اس نے اگر میرے جذبے کو بھی اکسایا اور مجھ سے میری زبان میں اپنے اظہار کا راستہ مانگا اور مجھے لگا کہ میں اس تقاضے کی تکمیل کر پاؤں گا تبھی میں نے اس ادب پارے کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔یعنی میں ترجمے سے پہلے تخلیق سے مانوس ہوجانا ضروری سمجھتا ہوں۔ جب تک تخلیق اور ترجمہ ایک ہی ذہنی افق پر نظر نہ آنے لگیں ترجمہ خصوصاً شاعری کا ترجمہ اثر کو ترشار ہے گا''

ترجمے کے ماہرین اعلیٰ ترجمے کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اعلیٰ ترجمے وہ ہیں جو شاعر کے خیال یا جذبے کو من وعن پیش کرتے ہیں۔اس میں علامتوں، استعاروں اور پیکروں کے نظام کو خاص اہمیت دی جاتی ہے ترجمے کو حذف واضافہ سے پاک رکھا جاتا ہے۔اس کے علاوہ بلیغ اشاروں، حکیمانہ لفظوں، فلسفیانہ خیالات، جذبے کی رواور تاثر کو پوری شادابی اور شدت کے ساتھ ترجمے میں سمویا جاتا ہے۔اس میں بنیادی خیال، جذبہ یا فکر کے ساتھ زبان، تکنیک

اوراسلوب پر بھی توجہ دی جاتی ہے گویا ترجمے میں فن کے خارجی اور داخلی عناصر کا خوبصورت امتزاج ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ابو شمیم خان اپنے مضمون ''ترجمہ: ایک تہذیبی اور لسانی مفاہمہ'' میں لکھتے ہیں:

''ترجمہ ایک مشکل اور کبھی کبھی ناممکن عمل ہے ۔ اس کے باوجود بنیادی ضرورتوں کے پیش نظر اس امر مشکل کو کرنا ہی پڑتا ہے جس میں بے انتہا دشوار یاں اور پریشانیاں درپیش ہوتی ہیں۔ مترجم کو خاردار جھاڑیوں سے اپنا دامن بچا کر منزل مقصود تک پہنچنا ہوتا ہے۔ ادبی تراجم کے سفر میں بہت ساری پریشانیاں اور کلفتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ نثری ادب کے مقابلے شعری ادب کے تراجم میں پریشانیاں اور بڑھ جاتی ہیں۔ علوم کے ترجمے میں صرف مواد کو منتقل کرنا ہوتا ہے اسلوب کو نہیں۔ جب کہ ادبی تراجم میں ایک تہذیبی سانچے کو دوسرے تہذیبی سانچے میں ، ایک شعری ونثری روایت کو دوسری نثری وشعری روایت میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ جملوں کی ساخت، آہنگ اوراسلوب کی نیت کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے اوراسے بھی مطلوبہ زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے ۔اصل زبانوں کے لفظوں کے جادو کو مطلوبہ زبان کی لفظیات میں جگانا ہوتا ہے جو کہ آسان امر نہیں ہے کیوں کہ زبانوں کی نفسیات،صوتیات،نحوی ترکیب،لغات، لہجے اور محاورے ایک دوسرے سے کافی مختلف ہوتے ہیں اوران میں ترجمہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ مترجم کو کافی Challenges کا سامنا ہوتا ہے اور بیک وقت بہت سارے لوازمات کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوتا ہے۔ نثری ادب کے مقابلے شعری ادب کے

تراجم میں یہ پریشانیاں دوبالا ہوجاتی ہیں خصوصاً غزل کے ترجمے میں۔نظم چونکہ کسی ایک خاص موضوع پر محیط ہوتی ہے اور نسبتاً طویل ہوتی ہے۔شعری پابندیاں غزل کے مقابلے کم ہوتی ہیں یعنی مترجم کو اس کے سمجھنے اور ترجمہ کرنے میں نسبتاً آزادی اور آسانی ہوتی ہے لیکن یہ آسانی غزل کے ترجمے میں نہیں ہوتی اور بہت ساری پریشانیوں اور Challenges کا سامنا ہوتا ہے۔تجربہ کار، کہنہ مشق اور تخلیقی ذہن رکھنے والا مترجم ہی ان مسائل ومشکلات اور پریشانیوں سے ابر سکتا ہے۔ترجمہ کی پریشانیاں، مسائل ومشکلات اس وقت مشکل تر ہوجاتی ہیں جب دونوں زبانوں کی صوتیات ،ترکیب نحوی ، لغات، لہجے اور محاورے اور دونوں زبانوں کی تہذیب اور ان کا مزاج مختلف ہو اور ترجمہ ادب خصوصاً شعری ادب کا ہو۔ایک اچھا مترجم زبان کی معنوی خصوصیات کو ملحوظ رکھتا ہے کیوں کہ دو زبانوں میں بامعنی اظہار کے لئے ایک ہی طرح کی علامت نہیں ہوتی ہے جس سے ترجمہ میں معلومات کی مکمل ومن وعن ترسیل کا زیاں ہوتا ہے۔''

یک اور مسئلہ ترسیل وابلاغ کا ہے۔شاعری چونکہ اشاروں، رمز وایما اور علامتی اسلوب کی حامل ہوتی ہے اور اس علامتی لفظ کے بدلنے سے نظم کی پوری کائنات درہم برہم ہوجاتی ہے۔شاعری میں معنی آفرینی یا اثر پیدا کرنے کی خوبی زبان وبیان اور لفظیات کے مخصوص استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔شعری معنی صرف الفاظ ہی سے نہیں بلکہ شعر میں ٹھیک اسی جگہ ان کے استعمال اور ان کے صوتی پیکر سے پیدا ہوتے ہیں اور ظاہر ہے ترجمے کے عمل میں ان تمام امور کا ایک ساتھ منتقل ہونا ناممکن ہوتا ہے۔شاعری کے ترجمے میں صرف شاعرانہ خیال یا اس کا مضمون ہی ترجمہ ہو پاتا ہے۔

بقیہ فنی نزاکتیں زائل ہوجاتی ہیں۔

ایک مسئلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ شاعری صرف الفاظ ہی کا نام نہیں بلکہ شاعر کے احساسات، جذبات پھر لفظ کی نزاکتیں وغیرہ بھی اس میں شامل ہوتی ہیں اوران چیزوں بالخصوص احساسات، جذبات اور تجربوں کو پہلے تو سمجھنا اور پھر خود لفظ میں ڈھالنا کمال ہے کجا کہ انہیں ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کیا جائے ۔ شاعر دراصل جذبات اوراحساسات کی ایک دنیا سے گزر کراس میں حاصل ہونے والے تجربہ کوالفاظ میں ڈھالتا ہے چنانچہ منظوم مترجم سے یہ توقع کرنا کہ وہ بھی ٹھیک جذبات واحساسات کی اسی دنیا سے گذرے اورانہی الفاظ کے قالب میں مطالب کو ڈھالے ایک ظلم ہے۔ بلکہ بعض اشعارتو ایسے ہیں کہ ان کی شرح ہی دقت طلب کام ہے تو پھر ترجمہ بھلا کیسے ہو اسی بنا پر ایذرا پاؤنڈ نے شعری ترجمہ کو تین حصوں میں بانٹا ہے۔

1۔ فونو پوئیا Phonapoeia ایسی شاعری جس کا ترجمہ کسی حدتک ممکن ہے اردو میں جیسے مثنوی کی بیانیہ شاعری یا ترقی پسندانہ خطابیہ شاعری یا سادہ شاعری۔

2۔ میلو پوئیا Melopeia ایسی شاعری جس کا ترجمہ ناممکن ہے اردو میں جیسے علامتی نظمیں غزلیہ شاعری۔

3۔ لوگو پوئیا Logopoeia ایسی شاعری جس کا ترجمہ ناممکن ہے لیکن اصل خیال کی جھلک ترجمے میں آسکتی ہے اردو میں جیسے فکری وفلسفیانہ اور خیال بندانہ شاعری۔

پروفیسر بشیر احمد نحوی اپنے ایک مضمون ''قنطار۔ رؤف خیر کا منظوم شاہکار'' میں لکھتے ہیں:

> ''ترجمہ کاری یا ترجمانی ایک مشکل کام کا دوسرا نام ہے۔ نثری ادب کا ترجمہ ایک زبان سے دوسری زبان میں کرنا قدرے آسان ہے لیکن شعری ادب کا ترجمہ اور وہ بھی منظوم انداز میں ستم بالائے ستم ہے۔ علامہ اقبال کے فارسی کلام کو کئی مترجمین نے اردو میں منتقل کرنے کی مساعی کی ہیں، جن میں چند

بارآور ثابت ہوئیں اور ایسی کوششیں بھی ہوچکی ہیں جو فکر اقبال سے زیادتی کے مترادف ہیں۔ اقبال کے فکری ابعاد و جہات کا احاطہ کرنا کوئی آسان عمل نہیں ہے کیونکہ یہ فکر الٰہیات، عمرانیات، تاریخ اور قدیم جدید فلسفے کی دانشورانہ بصیرت کا حامل ہے۔ دانشور اقبال کے شہ پاروں اور قطعات وغزلیات کا منظوم پرائے میں ترجمہ کرنا ایک پختہ ذہن اور تصورات اقبال سے ہم آہنگی رکھنے والے مترجم کا تقاضہ کرتے ہیں۔''

شعری ادب کے تراجم کے دوران سب سے بڑا مسئلہ یہ درپیش ہوتا ہے کہ ایک زبان کا شعری فن پارہ کسی مخصوص صنف میں تخلیق پاتا ہے اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ دوسری زبان میں بھی وہ صنف پائی جائے۔ اس لئے شعری متن کا ترجمہ ایک بہت بڑی مشکل کھڑی کرتا ہے۔

بعض مترجم کسی فن پارے کی خصوصیات یعنی الفاظ کی موسیقی، لب ولہجہ کے زیر و بم، بحر و وزن کی نغمگی کو ترجمے میں منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اول تو کسی فن پارے کی خارجی خصوصیات کی دوسرے فن میں منتقلی کو ترجمہ نہیں کہتے اور دوسرا ایک زبان کی خارجی خصوصیات کو دوسری زبان اور فن میں منتقل بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ترجمے میں مصنف کے بنیادی خیال کی ترسیل ہی مقصود بالذات ہوتی ہے۔ خارجی خصوصیات کی منتقلی کی ناکامی کی نمایاں مثال اردو کی آزاد نظم ہے۔ اس کی ایک مثال جاپانی شاعری کا اردو ترجمہ ہے۔ جاپانی زبان کی ساخت اردو زبان کی ساخت سے مختلف ہے۔ اس کی اصناف اور شعری ہیئتوں کی ایک مخصوص عروضی تنظیم ہے۔ جاپانی شاعری میں رکن کا وہ تصور نہیں جو اردو یا انگریزی میں ہے۔ اس لئے جنہوں نے جاپانی شاعری کا جاپانی ہیئتوں کی خارجی خصوصیات کے ساتھ اردو میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے انہیں ناکامی ہوئی۔ منصور احمد کا خیال ہے کہ:

''ہیکو نظموں کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ حسین اجمال کی تفصیل اسے حسن سے معری

کر دیتی ہے۔ ہیکو نظم گھاس کی پتی کے ساتھ لٹکتا ہوا شبنم کا وہ قطرہ ہے جو مختلف اطراف سے دیکھنے پر کبھی نیلا کبھی سرخ اور کبھی ارغوانی شعاعیں پیدا کرتا ہے۔

ف۔س۔اعجاز اپنے مضمون ''شاعری کا ترجمہ، چند عملی مسائل'' میں لکھتے ہیں۔

''پیرافریز Paraphrase یعنی کسی عبارت کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں ادا کرنا ترجمہ کی آسان منزل ہے لیکن شاعری کے ترجمے میں فارم کی شرط لگادی جائے مثلاً انگریزی سانیٹ کا ترجمہ اردو میں بھی سانیٹ ہی میں کیا جائے تو مترجم کو واقعی بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے انگریزی میں چودہ سطروں میں کہی گئی نظم کا ترجمہ اردو میں چودہ مصرعوں میں ہی مکمل ہونے کی ضمانت نہیں دی جاسکتی ۔ وہ بھی ہیئت کے التزام کے ساتھ کہ چار چار مصرعوں کے تین بند قوافی وردیف کے ساتھ مکمل ہوں پھر دو مصرعے، مطلع، غزل یا مثنوی کے شعر کی طرح موزوں کئے جائیں۔لفظ بہ لفظ مصرع بہ مصرع ترجمہ غالباً ممکن نہیں ہوگا۔ایسی صورت میں مترجم زیادہ سے زیادہ متن کے مجموعی مفاہیم کی ادائیگی اوراردو کی شعری وعروضی پاسداری کے سوا کیا کرسکتا ہے ۔ یعنی پیرا فریز سے بچ کر چلنا صرف مترجم کے ارادے اورصلاحیت پر منحصر نہیں ہے۔ میں نے ولیئم شیکسپیئر کے چند سانیٹ اردو میں ترجمے کئے تو بڑی مشکلوں سے دو چار ہوا۔لغت بھی میری زیادہ مدد نہیں کرتا تھا۔ایک تو سوا چار سو سال پرانی انگریزی وہ بھی شیکسپیئر کے طرز خاص

میں ۔ زبان کا وہ طرز خاص اب متروک ہو چکا ہے۔ شیکسپیئر کے اسم، فعل، رموز واوقات کا ٹھیک ٹھیک سمجھنا کارے دارد ہے۔ وہ اس کے اسلوب میں بہت سموئے ہوئے ہیں۔ ویسے بھی میں انگریزی ادب کا طالب علم کبھی نہیں رہا۔ بس یہ زبان کالج اور نیورسٹی میں میرا میڈیم تھی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اپنی کم علمی کا اعتراف کرنا میرا فرض ہے۔ خیر میں اپنا کوئی تجربہ بیان کررہا تھا۔ میں نے اصل متن کے کلیدی مصرعوں کو اردو مصرعوں میں اس طرح موزوں کیا کہ معنی دونوں قریب قریب متبادل کہلائیں۔ پھر سانیٹ کے اصل مقصد اور شاعر کے لب ولہجہ کو بہت انہماک سے دیکھا۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی لیکن ایسا محسوس ہوا کہ شیکسپیئر جیسا بڑا شاعر بھی عام شاعروں کی طرح بیچ بیچ میں کچھ بے ربط یا اول فول کہہ جاتا ہے جس سے صرف نظر کرنا مترجم کے لئے بہر حال جائز نہیں لیکن جس صنف سخن میں ترجمہ کیا جارہا ہے اس کی پابندی اور خود ترجمے کی اثر پذیری کا خیال مترجم کو قدرے ردوکد پر مجبور کرسکتا ہے۔ ایسی صورت میں تعقید لفظی کا سہارا لیا جائے تو بہتر ہے یعنی الفاظ اپنے صحیح مقام پر سے آگے پیچھے کردیئے جائیں تو کسی حد تک بات بن سکتی ہے۔ یہاں آکر پیرافریز سے ہٹ کر خلاصہ آرائی کا کوئی طریقہ مترجم کو حسب حال خود دریافت کرلینا پڑتا ہے۔ جس سے اصل متن اور ترجمے میں مطابقت اور انحراف کا کوئی خوشگوار اور معاون پہلو پر آمد ہوسکتا ہے۔''

درج بالا اقتباس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اصل زبان کی کسی صنف کو ٹھیک اسی زبان میں منتقل کرنا تقریباً

ناممکن ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اصل زبان والی صنف بدفی زبان میں نہ ہو، یا ہوسکتا ہے کہ اصل زبان کی وہ صنف ہی متروک ہوگئی ہو اس طرح کے کئی مسائل منظوم ترجمہ کرنے والے کے سامنے آسکتے ہیں۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ مترجم کو اتنی آزادی دی جائے کہ وہ یا تو الفاظ کو آگے پیچھے کرے یا پھر اصل زبان والی صنف کی جگہ بدفی زبان میں کوئی اور صنف استعمال کرے۔

نظم وشاعری کی سب سے خاص بات یہ ہوتی ہے کہ اس میں صوتی توازن اور آہنگ پایا جاتا ہے اور ترجمے کی دوران نہیں منتقل کرنا نہایت مشکل کام ہوتا ہے۔قدامت پسند ادیبوں کا خیال ہے کہ نظم کی شعریت زبان میں مضمر ہوتی ہے۔ان دونوں صورتوں سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ اگر انگریزی نظم کی شعریت زبان میں مضمر ہے تو اس شعریت کے ضروری اجزاء زیرو بم یا آہنگ اور صوتی توازن بھی ہیں۔ لہٰذا انگریزی سے ترجمہ کرتے وقت ردھم(Rhythm) اور کیڈنس(Cadence) کو منتقل کرنا نہایت مشکل کام ہوتا ہے۔اس لئے کسی انگریزی نظم کا ترجمہ کرتے وقت مترجم کو اپنی پسند اور انگریزی نظم سے مطابقت رکھتے ہوئے کسی عروضی کا استعمال کرنا چاہئے۔

شاعری کا ترجمہ میں ایک اور مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی زبان استعاراتی زبان ہوتی ہے اور اس استعارے کو دوسری زبان میں ٹھیک ٹھیک بدلنا ناممکن ہے۔زیادہ سے زیادہ اس استعارے کے ایک پہلو پر توجہ دی جاسکتی ہے۔جس سے اس کے دیگر پہلو دب کر رہ جاتے ہیں۔ اس بات کے پیش نظر استعارے کی شعری زبان کو ترجمہ کرنا نہایت غیر مناسب اور مشکل کام ہے۔ ہر شعری تخلیق کا اپنا ایک اسلوب ہوتا ہے جو طرز بیان ادائے نگارش، انداز تخاطب اور لب ولہجہ کی بناء پر دوسری شعری تخلیق سے مختلف ہوتا ہے۔

ایک اور مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ شعری زبان عروض وقافیوں میں بندھی ہوتی ہے اور اگر شعری ادب کے تراجم کے لئے ان پابندیوں کو بروئے کار نہ لایا جائے تو عروض قافیے اور اضافتوں سے تعلق رکھتی ہیں تو شعری ادب کے تراجم کے مسائل کو بڑی آسانی کے ساتھ حل کیا جاسکتا ہے لیکن اگر شاعری کا ترجمہ منظوم زبان میں ہی کیا جائے تو ان ذمہ داریوں

سے عہدہ برآ ہوا جا سکتا ہے۔ضروری نہیں کہ قالب نظم کی اسی صنف کا ہو جو اصل زبان میں موجود ہے بلکہ یہ قالب دوسری صنف کا بھی ہوسکتا ہے۔لیکن ضروری یہ ہے کہ اسے شاعری ہی کی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔کہا جاتا ہے کہ شاعری انسان کے قلب ونظر کی گفتگو ہے اور اسے قلب ونظر کی گفتگو ہی میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ترجمے کے عمل کو قلب ونظر کی گفتگو بنا دینے سے اعلیٰ شعری وادب کے در وبام کھل سکتے ہیں۔

9.4 عمومی جائزہ

شعر کا شعر میں ترجمہ منظوم ترجمہ کہلاتا ہے۔ایک اور تعریف کے مطابق کسی بھی شعری تخلیق کو جب ہم اس کے مرکزی خیال اور مجموعی تاثیر کے ساتھ دوسری زبان میں شعری عمل کے ذریعے ڈھالتے ہیں تو اسے منظوم ترجمہ کہا جاتا ہے۔غور سے دیکھا جائے تو یہ بازتخلیق کا ایک عمل ہے۔کہا جاتا ہے کہ منظوم ترجمہ میں صرف الفاظ کو دوسری زبان کے الفاظ سے بدل دینے سے ہی کام مکمل نہیں ہوتا بلکہ شعری تصنیف کی پوری فضا کو اس کے تمام تہذیبی حوالوں کے ساتھ ترجمے کی زبان میں اس طرح منتقل کرنا ہوتا ہے کہ اس زبان (ترجمے کی زبان) کے بھی ادبی وشعری مزاج کے تمام تقاضوں سے عہدہ برآ ہوا جا سکے۔

چنانچہ جہاں تک منظوم ترجمے کے اصول وتقاضوں کا تعلق ہے تو سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ مترجم کو دونوں زبانوں یعنی تصنیف کی زبان اور ترجمے کی زبان سے واقفیت ہو۔اسکے ساتھ ہی اصل زبان اور بدفی زبان کے تہذیب پس منظر سے واقفیت بھی بے حد ضروری ہے۔واقعہ مشہور ہے کہ جب ایک انگریز نے میر کا یہ شعر پڑھا کہ :

جو اس شور سے میر روتا رہے گا

تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

تو اس نے استاد سے پوچھا کہ میرؔ اتنا رونے دھونے کے بجائے اس محبوب سے جا کر مل کیوں نہیں لیتا۔ظاہر

ہے کہ اردو ادب کا محبوب، اس کی نزاکتیں اور ضروری بھی نہیں کہ وہ محبوب کوئی لڑکی ہی ہو، وہ فرضی محبوب بھی ہوسکتا ہے ان تمام باتوں کو سمجھنا ایسے شخص کی بات نہیں جو مشرقی روایات سے نابلد ہو۔ اس شعر کو سمجھنے کے لئے مشرق کے شرمیلے اشارے کنایے اور لطیف مزاج کو سمجھنا ضروری ہے۔ چنانچہ مترجم کے لئے اس وقت تک اشعار کا ترجمہ ممکن نہیں ہوتا جب تک وہ دونوں زبانوں کی تہذیبی واقفیت نہ رکھتا ہو۔ ف۔س۔اعجاز اپنے مضمون ''شاعری کا ترجمہ، چند عملی مسائل'' میں لکھتے ہیں۔

> ''ترجمہ یوں تو ایک سے دوسری زبان میں متن کی لسانی اور معنیاتی منتقلی کا نام ہے لیکن اس کا ایک منصبی پہلو بھی ہوسکتا ہے اور وہ ہے اصل زبان کی ادبی صفات اور اس زبان سے وابستہ تہذیبی قدروں سے حصول آشنائی۔ مثلاً کالی داس یا رابندر ناتھ ٹیگور کے شہکاروں کے ترجمے کے ذریعہ ہم سنسکرت اور بنگلہ کے شعری نظام کے علاوہ مخصوص عہدے کے مخصوص کلچروں کی نمائندگی کرنے والے فنکاروں کے طرز فکر اور عالم خیال سے آگاہ ہو پاتے ہیں۔ ترجمہ برائے ترجمہ یا ترجمہ برائے تفریح طبع کوئی اہم مقصد نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس ترجمے کے ذریعہ سے بڑے مقصد کی تکمیل مترجم کی ذولسانی تفہیم اور فطری اپج پر منحصر ہوتی ہے۔ یعنی جس زبان سے ترجمہ کیا جارہا ہے اور جس زبان میں ترجمہ کیا جارہا ہے ان دونوں کی اتنی سدھ بدھ مترجم کو ہونی چاہئے کہ وہ ایک طرف اصل متن کے اشارات ومفاہیم وصول کرسکے اور دوسری طرف ان موصولہ اشارات ومفاہیم کو اپنی زبان میں ادا کرسکے''

ڈاکٹر احمد امتیاز اپنے مضمون ''اردو میں ادبی ترجمے کی روایت'' میں لکھتے ہیں:

''ادبی تخلیقات کا ترجمہ کرتے وقت الفاظ اوراس کے مفہوم کے ساتھ ساتھ
اس تہذیبی سیاق کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے جن میں اس کی تخلیق ہوئی ہے۔
ادبی تراجم میں نثر سے زیادہ نظم کے ترجمے میں دقت پیش آتی ہے۔ نثری
متون کے مفہوم تک رسائی جس طریقۂ کار یا اصول کے تحت ہوتی ہے اس
کے بالکل برعکس نظم کے ترجمے وجود میں آتے ہیں۔ اس لئے کہ نظم کی قواعد
اصولی اعتبار سے بالکل جدا ہوتی ہے۔ دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ نظام کی
تعمیر تخیل، محاکات اور جذبات کے اتار چڑھاؤ سے ہوتی ہے جب کہ نثر کی
تعمیر میں جذبات کی شدت اور تخیل کی پرواز کا گراف بہت سطحی ہوتا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی منظوم ترجمے کی ذمہ داری کو ضروری حد تک نبھانے کے لئے مترجم کا ذوق سلیم سے آراستہ ہونا اور عروض سے واقف ہونا بھی انتہائی لازمی ہے۔ مترجم سے یہ بھی توقع کی جاتی ہے کہ وہ شعری ذخیرے اور شعری روایات سے بھی آشنا ہو۔ اسے اگر ان سے پوری واقفیت نہ ہو تو صحیح صنف کا انتخاب کرنا مشکل ہوگا۔ منظوم ترجمے کے لئے صحیح ہیئت کا انتخاب بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ نثر میں تو مترجم ایک ادھ سطر زیادہ یا کم کر کے اپنی بات کی ترسیل کرسکتا ہے تاہم نظم میں یہ ناممکن ہے۔ اسے صنف میں متعینہ اشعار کی تعداد سے تجاوز کرنے کی آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر وہ رباعی میں ترجمہ کرنا چاہ رہا ہے تو اس کے لئے لازم ہوگا کہ وہ صرف چار بندوں ہی میں اپنی بات مکمل کرے، پانچویں بند کی اسے اجازت نہیں ہوگی۔ ایک بات اور بھی کہی جاتی ہے کہ نظم کا منظوم ترجمہ کرنے سے پہلے اگر اس کا نثری ترجمہ کرلیا جائے تو کام آسان ہوجائے گا اور کوئی اہم پہلو نہیں چھوٹے گا۔ نثری ترجمے میں تو کچھ جملے بدلے جاسکتے ہیں اور کچھ اضافہ کیا جاسکتا ہے لیکن منظوم ترجمے میں ایسا نہیں کیا جاسکتا۔ مترجم کو منظوم ترجمے میں شعری تصنیف کی روح اور جذبہ کو سمو دینا چاہئے۔ کہا جاتا ہے کہ نثر میں آدمی بین السطور میں بہت کچھ کہہ جاتا ہے جس کو

سمجھنااور ترجمہ کرنا ایک مشکل کام ہے تاہم شاعری میں تو اور بھی دشوار کن ہے، یہاں بات بین السطور نہیں ہوتی بلکہ ماورائے سخن ہوتی ہے اور سخن سے ماورائے سخن کو اخذ کر کے اسے منتقل کرنا ایک مشکل ترین کام ہے۔

منظوم ترجمے کے وقت مترجم کو یہ امر ذہن میں رکھنا چاہئے کہ کیا وہ اصل شاعر کے مقصد کو اپنے قاری تک پہنچا سکا ہے ۔ کیوں کہ منظوم ترجمے میں محض مفہوم کی ترسیل تک ہی معاملہ محدود نہیں رہتا بلکہ شعری تصنیف کی وہ فضا جو تشبیہات ،استعارات ،احساس جمال ،قوت تخیل اور جذبہ واحساس کے باہمی اتصال وامتزاج سے وجود میں آئی ہے اس تک قاری کی رسائی ہونی ضروری ہے۔ ہر زبان کا اپنا تشبیہاتی واستعاراتی سرمایہ ہوتا ہے۔اپنے محاورے، تراکیب اور علامتیں ہوتی ہیں۔ضروری نہیں کہ دوسری زبان میں وہ لفظ بہ لفظ موجود ہوں،اس لئے مترجم کو چاہئے کہ ان کے لفظی ترجمے پر زور نہ دے بلکہ ان کے مفہوم اور معنی کی ترجمانی ترجمے کی زبان میں پائے جانے والے ان مترادفات ومماثلات کے ذریعہ کرے۔

مترجم کو منظوم ترجمہ کرتے وقت ان سب کو مدنظر رکھا ضروری ہے۔اپنے معتقدات، احساسات اور جذبات کو شاعر بہترین الفاظ میں نظم کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔مترجم کا فریضہ ہے کہ وہ ترجمے میں بھی اس صورت کو برقرار رکھے۔منظوم ترجمے کے وقت ہیئت وفارم کا تعین بھی بے حد ضروری ہے اردو شاعری کی اصناف اپنی الگ الگ خصوصیات رکھتی ہیں۔اصناف شعر ہر زبان میں الگ بھی ہوتی ہیں۔مثلاً غزل فارسی میں ہے انگریزی میں نہیں ۔ مترجم کو یہ چاہئے کہ شعری متن جس ہیئت میں ہے اس کے قریب ترین جو ہیئت ترجمے کی زبان میں ہو اس کا انتخاب کرے تاکہ اصل فن پارے کی بیشتر شعری خصوصیات ترجمے میں منتقل ہوسکیں۔منظوم ترجمے میں ایک اور خوبی ہونی چاہئے جس زبان میں منظوم ترجمہ کیا جائے اس زبان کی شاعری کے معیار پر اسے پورا اترنا چاہئے ۔شعری تخلیق کا آہنگ ،موسیقیت ،تاثراتی فضا اور کیفیت کو ترجمہ میں منتقل کرنے میں مترجم تبھی کامیاب ہوسکتا ہے جب وہ تصنیف وترجمے دونوں کی زبان کے ادبی ، شعری اور فنی تقاضوں سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔ ف۔س۔ اعجاز اپنے

مضمون ''شاعری کا ترجمہ چند عملی مسائل'' میں لکھتے ہیں

''دیگر زبانوں سے اردو میں شاعری کا منظوم ترجمہ کرتے ہوئے کچھ باتوں کا بطور خاص لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً اصول ترجمہ، ترجمانی، اسلوب ترجمہ (پابند یا غیر پابند وغیرہ) ۔ انگریزی اور دیگر زبانوں کی کلاسیکی اور جدید شاعری میں اوزان وبحور کا التزام کیا جاتا ہے اور نہیں بھی کیا جاتا ہے ۔ ایسا بھی دیکھا ہے کہ ایک نظم بیشتر پابندی ہوتی ہے لیکن بیچ بیچ میں معریٰ یا نثری شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ کی نظموں میں دو یا دو سے زائد بحریں بھی استعمال ہوئی ہیں جس کا ایک مقصد مروجہ فارم سے انحراف ہے تو دوسرا مقصد پیرایہ اظہار میں قصدا ایک سے زیادہ ''لہجوں'' کے استعمال سے نظموں کی ساخت اور آہنگ کو متاثر کرنا ہے تا کہ اصوات والفاظ کھردرے پن یکسر عاری نہ ہوں۔ ممکن ہے اسے اصل زبان کی شعری خصوصیت قرار دیا جائے لیکن کوئی اسے عجز شاعر پر بھی محمول کر سکتا ہے ۔ ایسے بعض مواقع پر ترجمے کا آہنگ بھی کسی لغزش یا ناہمواری کا شکار ہو سکتا ہے، لیکن ترسیل معانی، مجموعی تاثر اور کائنات نظم کی ترجمے میں منتقلی وہ اہم چیزیں ہیں جن پر ترجمے کی کامیابی کا انحصار ہوتا ہے۔ مترجم اگر شاعر بھی ہو تو شاعرانہ صلاحیت اس کام میں اسکی معاون سمجھی جائے گی۔''

چنانچہ مترجم کو آزادی دینے کی بھی ضرورت ہے اور اس آزادی پر کنٹرول کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ آزادی اس لحاظ سے کہ وہ دیگر زبانوں کے ایسے الفاظ کو ترجمے میں جوں کا توں لے لے جس کا کوئی تہذیبی پس منظر ہو، نئے

الفاظ کے ڈھالنے کے چکر میں اپنی زبان کو مزید ادق نہ بناوے، نئے اسلوب وافکار کو ترجمے میں منتقل کرے، نئی ادبی تحریکات کی بنیاد ڈالے اور آزادی پر کنٹرول اس لحاظ سے یہ آزادی اسے اصل سے انحراف نہ کرنے دے۔ اصل زبان کا متن، اس کا مفہوم اور اس کی فکر کو تقریباً حد تک منتقل کرے۔ کچھ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر اصل متن میں کوئی ثقل وسقم ہو تو مترجم کو چاہئے کہ اسے وہیں روک دے اور موروثی نہ ہونے دے۔

9.5 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ اردو میں نثری اور منظوم ترجمے کے فرق پر اپنے تاثرات قلم بند کیجئے۔

2۔ نثری اور منظوم تراجم کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالئے۔

3۔ نثری اور منظوم تراجمے کے اصول اور مسائل پر مدلل بحث کیجئے۔

9.6 امدادی کتب

1۔ مغرب سے نثری تراجم، از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

2۔ اردو میں ترجمے کی روایت، از قمر رئیس

3۔ ترجمے کا فن (نظری مباحث)، از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

اکائی نمبر 10: ترجمے میں اصطلاح سازی کی اہمیت، اصول ومسائل

ساخت:

10.1 تمہید
10.2 مقاصد
10.3 ترجمے میں اصطلاح سازی کی اہمیت، اصول ومسائل
10.4 عمومی جائزہ
10.5 سوالات
10.6 امدادی کتب

10.1 تمہید

اصطلاح سازی ایک تکنیک ہے۔ کسی تحریر کا ترجمہ کرتے وقت اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ ترجمے میں ایک زبان کے فن پارے کو دوسری زبان میں منتقل کرتے وقت بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اصل مسئلہ اصطلاحوں کا ہوتا ہے کیونکہ ایسی تحریروں میں سارا دارومدار اصطلاح پر ہوتا ہے۔ اگر صحیح اصطلاح کا انتخاب نہیں ہوا یا وہ صحیح طور پر وضع نہیں کی گئی تو متن کا مفہوم بھٹک جائے گا۔ کسی ادبی فن پارے کے ترجمے کے وقت دونوں زبانوں کے درمیان تہذیبی اصطلاحیں بھی مسئلہ کھڑا کرتی ہیں۔ سماجی علوم کے ترجموں کے وقت بھی اس طرح کے مسائل سامنے آتے ہیں۔ غرض ترجموں میں بنیادی مسئلہ اصطلاحوں کی وجہ سے ہی پیدا ہوتا ہے۔

10.2 مقاصد

اس اکائی کا مقصد اردو میں اصطلاح سازی کی تاریخ سے آپ کو متعارف کرانا ہے۔آپ کو بتانا ہے کہ اصطلاح کسے کہتے ہیں،اس کے وضع کرنے کے اصول کیا ہیں؟ یہاں ترجمے میں اصطلاح کی اہمیت پر روشنی بھی ڈالی جائے گی۔

10.3 ترجمے میں اصطلاح سازی کی اہمیت،اصول ومسائل

اردو میں ترجمہ نگاری کی روایت بہت پرانی ہے۔اردو میں ترجمہ کا کام اس کی ابتداء سے ہی سامنے آنے لگا تھا۔مذہبی عقائد اور حکایات کے ترجمے ہوئے تو ان سے جڑی عربی وفارسی اصطلاحیں مستعار لے لی گئیں۔قرآن شریف کے تراجم کے وقت میں یہی ہوا۔اردوادب پر اگر عربی وفارسی کے اثرات کا جائزہ لیں تو وہاں بھی ادبی اصطلاحات خواہ وہ اصناف سے متعلق ہوں یا اظہار سے زیادہ تر مستعار لے لی گئیں ہیں۔لیکن علوم فنون کے ترجموں کے وقت ایسا نہیں ہوا۔ یہاں ہمیں اصطلاحیں اختراع کرنی پڑی ہیں۔اردو میں یہ سلسلہ باقاعدہ طور پر مدرسہ غازی الدین کے قیام 1792ء سے شروع ہوا جب مشرقی اور مغربی علوم کے عربی وفارسی،انگریزی اور دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمے کرائے گئے۔مدرسہ غازی الدین کے ترقی کرنے اور نیشنل کالج دہلی بننے کے بعد علمی اور تعلیمی سرگرمیاں تیز ہوگئیں۔وہاں 117 کتابیں ترجمہ ہوئیں۔وہاں وضع اصطلاحات کے اصول مرتب ہوئے اور اس پر کتابیں بھی لکھی گئیں۔اس سلسلے میں مزید جو ادارے،انجمنیں اور سوسائٹیاں کام کررہی تھیں ان میں انجمن ترقی اردو،دارالترجمہ عثمانیہ،حیدرآباد اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اہم ہیں۔عبدالحق کی اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ، فرہنگ اصطلاحات عالیہ،انجمن ترقی اردو اصطلاحات علم جدیدہ،عثمانیہ یونیورسٹی،اصول وضع اصطلاحات از سید حسن بلگرامی اور وضع اصطلاحات از وحیدالدین سلیم اہم ہیں۔

اصطلاح اس مخصوص لفظ یا ترکیب کو کہا جاتا ہے جو مختلف علوم وفنون سے متعلق کسی خاص عنصر،آلے،عمل،تصور

یا نظریے کے لئے غیر لغوی معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً اردو کا ایک عام لفظ ہے گھڑی یعنی ایک مختصر سا وقت، لمحہ یا ساعت لیکن اصطلاح میں اس آلے کو گھڑی کہا جاتا ہے جو دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں کو منٹوں اور سکینڈوں میں تقسیم کر کے دکھاتا ہے۔ جب تک جدید ترین عددی (Digital) گھڑیاں ایجاد نہیں ہوئی تھیں، گھڑیاں صرف بارہ گھنٹوں کو منٹ اور سکینڈ کے کانٹوں اور رومن انگریزی ہندسوں کے ذریعے لکھی جاتی تھیں۔

زبان کے عام الفاظ مثلاً پانی، روٹی، مکان، سڑک، ہاتھ، پیر، آنکھ، آنسو، رونا، دھونا، کھانا، پینا، سونا روزمرہ کی زندگی سے متعلق ہیں اور ان کے معنی بچہ ہو یا بوڑھا سب کی سمجھ میں آتے ہیں لیکن اصطلاحوں کو جاننا اور سیکھنا پڑتا ہے۔ اوپر دی ہوئی مثال میں گھڑی کی اصطلاح اگرچہ بہت عام ہونے کے سبب ہمیں بچپن ہی سے معلوم ہو جاتی ہے مگر ریت گھڑی، دھوپ گھڑی، مقیاس الحرارت (تھرمامیٹر) ضرب، تقسیم، عاد اعظم، خط استوا، مربع، مکعب، مائع، مرکب، پیمانہ، استوانا، تلخیص اور ترجمہ جیسی اصطلاحات کو جاننے، سمجھنے اور برتنے میں وقت لگتا ہے۔

اصطلاح کی اہم خوبی یا خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک یا ایک سے زیادہ جملوں میں بیان کی جانے والی تعریف یا تشریح پوشیدہ ہوتی ہے اور اسے استعمال کرنے والا پورا جملہ یا ٹکڑا بولنے سے بچ جاتا ہے۔ کسی علم یا فن کے سیکھنے میں اصطلاحات کے سبب آسانی پیدا ہو جاتی ہے کیوں کہ ان کے معنی متعین ہوتے ہیں اور انہیں یاد رکھنا بھی آسان ہوتا ہے۔

جب کسی زبان کے متن کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کرنا ہوتا ہے تو سب سے پہلے اصطلاحات پر دھیان دینا ہوتا ہے۔ خصوصاً علم و فن سے متعلق شعبوں کی کتابوں یا تحریروں کا ترجمہ کرتے وقت نہ صرف ترجمے کی زبان میں مستعمل اصطلاحات کو تلاش کرنا پڑتا ہے بلکہ علمی و تکنیکی اعتبار سے ترقی یافتہ زبان سے ترجمہ کرنا ہو تو اصطلاحیں وضع بھی کرنی پڑتی ہیں۔

1919ء میں حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور اردو کو اعلیٰ تعلیمی سطح تک ذریعۂ تعلیم بنایا گیا

تو جدید علوم وفنون کی تعلیم وتدریس کے لئے انگریزی فرانسیسی، جرمن، عربی اور فارسی زبانوں کی کتابوں اور مقالوں کو اردو میں ڈھالنے کا کام شروع ہوا۔ ایک ادارہ دارالترجمہ قائم کر کے متعدد علوم وفنون کی کمیٹیاں بنائی گئیں جن میں ہندوستان بھر کے علماء اور ادباء کو شامل کر کے بڑے پیمانے پر تراجم کرائے گئے۔

اس زمانے میں مولوی وحیدالدین سلیم نے جو ایک ترجمہ کمیٹی کے رکن تھے، اصطلاحوں کے وضع کرنے کے کچھ اصول بنائے تھے جو ان کی کتاب ''وضع اصطلاحات' میں شامل ہیں۔ اس کتاب میں مولوی صاحب نے اصطلاح بنانے والے دو گروہوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں پہلا گروہ اس کا قائل ہے کہ تمام اصطلاحی الفاظ عربی زبان کی مدد سے بنائے جائیں۔ دوسرے گروہ کی رائے یہ ہے کہ اصطلاح وضع کرنے میں تمام زبانوں کے الفاظ سے کام لیا جائے۔ خصوصاً عربی، فارسی، ہندی زبانوں سے جن کے الفاظ اردو کی لسانی ساخت اور قواعد میں آسانی سے کھپ جاتے ہیں۔ مولوی صاحب دوسرے گروہ کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ مولوی صاحب اور دوسرے لوگوں کے خیالات س استفادہ کرتے ہوئے اردو میں اصطلاحات وضع کرنے کے مندرجہ ذیل اصول قائم کئے جاسکتے ہیں۔

1۔ اردو میں جو علمی اصطلاحیں وضع کی جائیں ان کے لئے عربی، فارسی اور ہندی سے الفاظ لئے جائیں۔

2۔ ان الفاظ کو ترکیب دیتے وقت اردو زبان کی گرامر کا لحاظ رکھا جائے۔

3۔ اگر کوئی اصطلاح انگریزی یا کسی اور زبان سے آکر اردو میں رائج ومستعمل ہوگئی ہو تو اسے جوں کا توں اپنا لیا جائے مثلاً سائنس، کمپیوٹر۔

4۔ دو مختلف زبانوں کے الفاظ کو ملا کر بھی اصطلاح بنتی ہو تو اسے اپنا لینا چاہئے۔

5۔ دو لفظوں کو پاس پاس رکھ کر اصطلاح بنائی جائے جیسے بجلی گھر

6۔ جن اصطلاحوں کی ہیئت بین الاقوامی ہے انہیں جوں کا توں رہنے دیا جائے۔

7۔ ایسی اصطلاحیں وضع کی جائیں جن سے حافظے پر زور کم پڑے۔

8۔ ثقیل اور بڑی ترکیبوں والی اصطلاحوں سے گریز کیا جائے۔

9۔ اصطلاحات رائج الفاظ کی مدد سے بنائی جائیں۔

10۔ اصطلاحی معنی کا نمایاں حصہ اصطلاحی لفظ سے ظاہر ہو۔

اصطلاح وضع کرتے وقت مادوں کے اعتبار سے ہمیں اصطلاحوں کو مختلف سیٹوں میں بانٹ لینا چاہئے (ضرورت پڑنے پر ہمیں انگریزی یا ہندی کے مادے بھی ملا لینا چاہئے) ایک اصطلاح سے متعلق نئے معنوں کے لئے ہم مروجہ سابقوں اور لاحقوں یا ایک اصطلاح کی صورت میں دوسرے لفظوں کو اس اصطلاح سے ملا کر پورا سیٹ مکمل کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل میں ایک سیٹ ملاحظہ کیجئے جس میں مادہ انگریزی سے ماخوذ ہے:

فون : فونیم

علم فونیم : فونیمیات فونیمیاتی

یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اصطلاح وضع کرتے وقت انہیں چھوٹے چھوٹے بامعنی حصوں میں بانٹ لینا چاہئے جیسے لفظ Phonetical کو لیجئے جس کے چھوٹے سے چھوٹے بامعنی اجزاء اس طرح ہوں گے۔ ان اجزا کے اردو میں متبادل ڈھونڈ لینے سے اصطلاح وضع ہو جائے گی جو اس طرح ہوگی، فونمیاتی۔

10.4 عمومی جائزہ

اصطلاح سازی کے عمومی اصول یہ ہیں۔

1۔ اصطلاحات حتی الامکان مختصر اور جامع ہوں اور جس مفہوم کے لئے بنائی گئی ہوں اس کے پورے معانی و مطالب کے اظہار کی ان میں صلاحیت ہو پڑھنے اور بولنے میں آسان ہوں۔

2۔ سنسکرت، فارسی اور ہندی الفاظ، اردو کے الفاظ شمار کئے جائیں اور اصطلاحات وضع کرنے میں اردو قواعد کے مطابق انہیں استعمال کیا جائے۔

3 عربی ہندی یا فارسی کے میل سے اصطلاحیں وضع کر کے الفاظ اور اصطلاحات کی گویا متحدہ قومیت کو بڑھایا جا رہا ہے۔ یہ رجحان علمی اور ادبی نقطہ نگاہ سے مستحسن ہے۔

4 دو یا دو سے زیادہ لفظ پاس پاس رکھ دئے جائیں خواہ ان کے درمیان کوئی رشتہ یا رابطہ ہو یا نہ ہو۔

5 الفاظ تو پاس پاس رکھے جائیں مگر ان میں گرامر کے لحاظ سے کوئی رشتہ یا ربط ضرور ہو۔

6 انگریزی الفاظ مقبول عام اور زبان زد ہو تو انہیں بجنسہٖ استعمال کیا جانا چاہئے۔

7 ہندی زبان کے الفاظ جو ہماری زبان کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں انہیں بے تکلف وضع اصطلاحات کے دوران کام میں لانا چاہئے۔

8 اصطلاحات کے بنانے میں سابقوں اور لاحقوں سے کام لینا اصطلاحات سازی کے مرحلہ کو آسان کر دیتا ہے۔

9 جب کسی انگریزی مصدر کے مقابل فعل یا مصدر بنانا ہو تو پہلے مصدر کے مادے کا ترجمہ کریں، پھر اس کے آگے اردو کی علامات مصدر سے کوئی مناسب علامت لگائیں۔

10.5 نمونہ برائے امتحانی سوالات

1۔ ترجمے میں اصطلاح سازی کی اہمیت پر روشنی ڈالیں۔

2۔ ترجمے میں اصطلاح سازی کے اصول و مسائل پر مدلل بحث کیجئے۔

10.6 امدادی کتب

1۔ وضع اصطلاحات، از وحیدالدین سلیم

2۔ مغرب سے نثری تراجم، از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

3۔ اردو میں ترجمے کی روایت، از قمر رئیس

۴۔ ترجمے کا فن (نظری مباحث) ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

اکائی نمبر 11: انگریزی سے اردو میں ترجمہ

ساخت:

11.1 تمہید

11.2 مقاصد

11.3 انگریزی سے اردو میں ترجمہ

11.4 عمومی جائزہ

11.5 سوالات

11.6 امدادی کتب

11.1 تمہید

ترجمہ کا میدان بہت وسیع ہے، اس کے ذریعے نئے نئے امکانات اور اضافے تشکیل پاتے ہیں، اس میں فلسفے جیسی پیچیدہ بحثوں سے لے کر شعر و ادب جیسی نازک اور دلکش اصناف ادب کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔

اگر چہ پہلے پہل ترجمے کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی تھی اور اسے محدود اور ثانوی حیثیت سے جانا جاتا تھا، ابتداء میں ترجمے کی ضرورت محض دینی ابلاغ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے محسوس کی جاتی تھی مگر بتدریج سائنس اور ادب بھی اس کے حصار میں آنے لگے اور آہستہ آہستہ اسے اہمیت دی جانے لگی جس کا نتیجہ ہے کہ آج ترجمہ باقاعدہ فن کی صورت اختیار کر چکا ہے اور موضوعات اور نوعیت کے اعتبار سے ترجمہ کی متعدد اقسام وجود میں آ چکی ہیں۔ اس اکائی میں تحریری ترجمہ written translation سے مراد ہے۔ تحریری ترجمہ یہ ہے کہ متن کو مطلوبہ زبان میں تحریری طور پر

منتقل کیا جائے ، یہ ترجمہ بعض پہلوؤں سے آسان سمجھا جاتا ہے کیوں کہ اس میں ترجمہ نگار کو جملوں کی ساخت اور الفاظ کی بندش کے لئے وافر وقت مل جاتا ہے کہ وہ اپنے تحریر شدہ ترجمہ کے مواد پر اچھی طرح غور اور نظر ثانی کر لے، اس میں حذف و اضافہ کر لے، الفاظ کے نوک پلک درست کر دے، اور ترجمہ میں جس قدر ممکن ہو سکے حسن پیدا کرنے کی کوشش کرے، لیکن ساتھ ہی ساتھ ترجمہ کی یہ قسم مشکل ترین بھی ہے کہ اس میں مترجم کو نہایت باریک بینی کے ساتھ متن کے اسلوب کی رعایت کرتے ہوئے الفاظ کو مطلوبہ زبان میں منتقل کرنا اور اسے ضبط تحریر میں لانا ہوتا ہے تاکہ مستقل میں کوئی اس کے ترجمہ پر انگلی نہ اٹھا سکے، اور قاری جب جب بھی اس کے ترجمہ کو پڑھے اس کے ترجمہ شدہ مواد کے بارے میں اچھا تاثر لے سکے۔ تحریری ترجمہ کے اس مختصر سے تعارف کے بعد تحریری ترجمہ کی موضوعات اور اسلوب کے اعتبار سے مختلف اقسام یہ ہیں۔ علمی ترجمہ، ادبی ترجمہ، قانونی ترجمہ، مذہبی ترجمہ، خودکار یا مشینی ترجمہ وغیرہ۔

11.2 مقاصد

پچھلی اکائیوں میں آپ نے ترجمہ کی ابتداء اس کے آغاز و ارتقاء، اس کے عملی مراحل، اصول و ضوابط، مترجم کے لئے مطلوبہ اوصاف کے بارے میں تفصیلات سے آگہی حاصل کی، اس اکائی میں انگریزی سے اردو زبان میں ترجمہ کے طریقہ کار اور اصول و ضوابط پر بات کی جائے گی، نمونہ اور مثال کے طور اشعار کا ترجمہ اور نثر کے ایک دو اقتباس میں پیش کئے جائیں گے جس سے طلبا کو ترجمہ نگاری کے بنیادی چیزوں سے آگہی حاصل ہوگی۔

11.3 انگریزی سے اردو میں ترجمہ

یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ دنیا میں مختلف زبانیں رائج ہیں اور ہر زبان کے اپنے اپنے قواعد ہوتے ہیں۔ اس طرح انگریزی اور اردو زبان کے بھی اپنے الگ قواعد اور گرامر ہے۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتے وقت ہمیں دونوں زبانوں کے قواعد اور گرامر کو ذہن میں رکھنا چاہئے۔ اردو کے مقابلے انگریزی میں کل ملا کر 26 حروف ہوتے ہیں جن میں 5 حروف Vowels (a,e,i,o,u) کہلاتے ہیں اور باقی 21 حروف Consonants کہلاتے ہیں۔ ترجمہ کرنے والا دونوں زبانوں کے اس فرق کو سمجھ لے تو اسے اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرتے وقت کوئی مشکل

نہیں آئے گی۔اردو کا یہ ترجمہ دیکھئے:

راشد اسکول جاتا ہے۔

اس جملے میں راشد فاعل (کام کا کرنے والا) ہے،'اسکول' مفعول ہے،اور'جاتا ہے' فعل (کام) کہلاتا ہے۔

اسی جملے کا انگریزی ترجمہ دیکھئے:

Rashid goes to school.

قواعد کے لحاظ سے دونوں زبانوں کے جملوں میں ترتیب کے اعتبار سے فرق نظر آتا ہے۔اردو کے جملہ میں سب سے پہلے راشد (فاعل) آیا پھر'اسکول' (مفعول) آیا اور آخیر میں'جاتا ہے' (فعل آیا)۔یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اردو کے جملے میں فعل جملے کے آخر میں آتا ہے۔لیکن انگریزی کے جملے میں یہ ترتیب بدل جاتی ہے۔دئے گئے انگریزی کے جملے میں سب سے پہلے راشد (فاعل) آیا، پھر'جاتا ہے' (فعل) اور'اسکول' (مفعول) آیا۔

Rashid goes to school

فاعل فعل مفعول

Subjetc Verb Object

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی کے اس جملے میں سب سے پہلے Subject پھر verb اور آخر میں ایک یا ایک سے زیادہ (object) آتے ہیں۔ہر جملے میں ایک فاعل Subject اور ایک فعل Verb کا ہونا ضروری ہے۔یہ انگریزی میں ترجمہ کرنے کا پہلا مددگار اصول ہے۔

فاعل فعل مفعول

یا

Subject Verb Object

ہر زبان میں فاعل اور فعل میں ایک مطابقت ہوتی ہے۔دیئے گئے جملوں کو دھیان سے پڑھیے۔

میں کام کرتا ہوں۔	I work
میں کام کرتی ہوں۔	I work

تم کام کرتے ہو	You work
وہ کام کرتا ہے۔	He works.
وہ کام کرتی ہے۔	She works
وہ کام کرتے ہیں۔	They works
لڑکے کام کرتے ہیں۔	Boys work
لڑکیاں کام کرتی ہیں۔	Girls work

اردو کے جملوں میں فاعل اور فعل کی مطابقت کے ساتھ ساتھ فعل کے عدد (واحد جمع) (Number)، شخص(person) اور تذکیر و تانیث (Gender) کے بیچ میں بھی مطابقت ہے۔ انگریزی کے جملوں میں اور Subject کے Numberاور Person کے مطابق Verb کے Numberاور Person جڑے ہوتے ہیں۔انگریزی میںSubject کے Gender کاVerb پرکوئی اثرنہیں پڑتا۔

ایک بامعنی جملہ بنانے کے لئے الفاظ کوایک خاص ترتیب میں لکھنا ضروری ہوتا ہے۔مثال کے طور پر یہ جملہ دیکھئے:

وہ ستار بجاتا ہے۔

انگریزی میں یہ جملہ ایسا بنے گا۔ He plays Sitar

لیکن اس جملے کے الفاظ کی ترتیب بدلنے پر اس کے مکمل معنی سمجھ میں نہیں آتے۔

Plays he Sitar (بجاتا ہے وہ ستار)

Sitar he plays (ستار وہ بجاتا ہے)

یہ دونوں جملے الفاظ کے مجموعے (Group of words) ضرور ہیں لیکن یہ بامعنی ترتیب میں نہیں ہیں اس لئے ایک بامعنی جملہ بنانے کے لئے الفاظ کوایک خاص ترتیب میں لکھنا ضروری ہوتا ہے۔

جملے خاص طور پر پانچ قسم کے ہوتے ہیں:۔

1۔ مثبت جملہ۔اسے Assertive Sentence کہتے ہیں۔جیسے:

میں لکھتا ہوں۔ I write

2۔ منفی جملہ۔اسے Negative sentence کہتے ہیں۔جیسے:

ہم جھوٹ نہیں بولتے۔ We do not tell a lie.

3۔ سوالیہ جملہ۔اسے Interrogative sentence کہتے ہیں۔جیسے:

تم کہا کام کرتے ہو؟ Where do you wor?

4۔ جملہ حکمیہ۔اسے Imperative sentence کہتے ہیں۔جیسے:

کھڑے ہو جاؤ۔ Stand up

5۔ فجائیہ جملہ۔اسے Exalamatory sentence کہتے ہیں۔جیسے:

وہ مارا!اب کھیل ختم ہو گیا۔ Hurrah! the game is over

ان کے علاوہ انگریزی اور اردو گرامر کے دیگر کئی قواعد ہیں جن کو یہاں شامل کرنا مشکل ہے۔انگریزی اور اردو چونکہ دنیا کی دو اہم زبانیں ہیں اور ان کا ادب بھی ضخیم اور وسیع ہے۔ان دونوں زبانوں کا ترجمہ کرنے کا فن کافی محنت، ریاضت اور معلومات چاہتا ہے۔ترجمہ نگار کو دونوں زبانوں سے اعلیٰ درجہ کی واقفیت ہونا ضروری ہے۔مترجم ترجمہ کرتے وقت لفظ کے لفظ، ترکیب کے لئے ترکیب، محاورے کے لئے محاورہ اور اصطلاح کے لئے اصطلاح تلاش کرتا ہے۔یہیں مترجم کا امتحان ہوتا ہے کیونکہ اس کو ضروری لفظ، محاورہ، یا اصطلاح کے قائم مقام یا مترادف الفاظ، محاورے یا اصطلاحات اس زبان میں نہیں ملتے۔مثال کے طور پر لفظ 'مٹھائی' کو لیجئے۔ہندوستانی تہذیب میں مٹھائی، کا تعلق کچھ اور ہے اور انگریزی تہذیب میں کچھ اور۔ہمارے یہاں لڈو، پیڑے، برفی، گلاب جامن، جلیبی، امرتی، نکتیاں، جیسی مٹھائیاں ہیں تو انگریزوں کے یہاں یہ چیزیں نہیں ہیں۔اُن کے یہاں یا تو Chocolate (چاکلیٹ) یا

Toffee (ٹوفی) ملے گی۔اس کے علاوہ زیادہ تر Candy (ایک عام لفظ امریکہ میں مشہور ہے جو چینی کے اقوام میں بنائی گئی انگلینڈ کی مٹھائی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے) ملتی ہے۔اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرتے وقت مسئلہ پیش آتا ہے کہ مترجم کو صحیح مترادف الفاظ انگریزی یا جس زبان میں ترجمہ کر رہا ہے نہیں ملتے۔اب لڈو کو لیجئے۔انگریزی میں اگر 'Sweet ball' ترجمہ کہا تو یہ لفظی ترجمہ تو ہوگا لیکن اصل مفہوم لڈو کے لئے پورے معنی ادا نہیں کرتا۔'چٹنی' کے لئے 'Souce' تو برفی کے لئے 'Sweet paste' سے برفی کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔'گلاب جامن' اگرچہ 'لڈو' کی طرح کی چیز ہے لیکن خود اردو میں دونوں کا مفہوم الگ الگ ہے۔اب اگر لفظی ترجمہ پے جایئے تو گلاب کے لئے 'Rose' اور جامن کے لئے 'Jamboline' استعمال کریں تو 'Rose Jamboline' سے گلاب جامن کا مطلب ادا نہیں ہوتا۔امرتی، اور 'جلیبی' جیسی مٹھائیوں کے لئے round-round-stop لکھنے سے کہ یہ مٹھائیاں کڑھائی (frying pan) میں تیل ڈال کر گیلے میدے کو گول گول گھما کر پھر ہاتھ روک لینے کے طریقے سے بنتی ہیں مفہوم ادا نہیں ہوتا۔دال، دلئے، کے لئے 'custard' اور 'pudding' کا استعمال ہے۔لباس میں ہمارے یہاں اچکن اور شیروانی ہے تو ان کے یہاں coat اور waist coat ہے۔یہاں پاجامہ (پائجامہ) تو ان کے یہاں Trouser اور Pant ہے اور اب لفظ 'Pantaloon' پتلون کے لئے عام استعمال کیا جاتا ہے۔ہر ملک کے ریتی رواج یعنی Custom or rituals اور traditions کہیں ملتے ہیں، یکساں ہوتے ہیں، کہیں تھوڑی تبدیلی کے ساتھ تو کہیں بالکل مختلف ہوتے ہیں۔مترجم کو ان سبھی فرقوں کو دھیان میں رکھنا چاہیئے، اور ترجمہ کی ضرورت کے تحت نئے مخصوص الفاظ جنہیں مخصوص معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے 'اصطلاح' (Term) کے طور پر ایجاد کرنے چاہئیں۔ جن الفاظ یا اصطلاحات کے لئے مترادف الفاظ یا اصطلاحات نہ ملیں انہیں جوں کو توں اُس زبان میں لکھ کر بریکٹ میں مختصر اس کی تشریح کر دینی چاہئے۔جیسے: Gulab Jaman

(A kind of Indian sweet, in small ball like shape soaked in sweet syrup.)

لفظ'بسکٹ' انگریزی کا ہے لیکن ہمارے یہاں 'Biscuit'(بسکِٹ) سے بِسکُٹ ہو گیا ہے۔ اردو زبان کی یہ خوبی ہے کہ اس نے انگریزی کے کتنے ہی الفاظ اپنے یہاں لے لئے ہیں اور وہ اجنبی نہیں لگتے یا دوسری زبان سے اخد کئے ہوئے نہیں لگتے۔ نان (ایک طرح کی روٹی) سے ہمارے یہاں baker سے لفظ 'نان بائی' بنا اور اسی طرح سے 'bakery'(بیکری) عرفِ عام میں مشہور ہے۔ بندیا بن (bun)جسے میٹھا کلچا یا شیر مال کہا جاتا ہے ہمارے یہاں انگریزی سے آیا۔ اگر یہاں بیکری میں پاپے، رسک، بندیا بن اور نان ختائیاں تیار کی جاتی ہیں تو انگریزوں کے یہاں پیسٹری (Pastry) اور کیک (Cake) تیار کئے جاتے ہیں۔ اس طرح بریڈ رول (Bread-Roll) اور بریڈ پکوڑے کو ہماری اور انگریزی طرز کی ملی جلی چیز کہا جا سکتا ہے۔ اسکول (School)، آفس (Office)، کالج (College)، ریلوے اسٹیشن (Railway Station)، ٹکٹ (Ticket)، بُش شرٹ (قمیض) یعنی 'Shirt' پاؤڈر یا پوڈر (Powder)، لپ اسٹِک (Lipstick) (ایرانی اردو میں مسی)، نیل پالش (ناخن پالش) Nail polish، یا صرف پالش (Polish) جیسے الفاظ اس کے علاوہ اور بھی اس طرح کے الفاظ اردو دنیا نے اپنے یہاں بغیر کسی ردو بدل کے لے لئے ہیں جو اردو میں مل گئے ہیں ۔ جیسے :گلاس (G l a s s)، پینٹنگ (Painting)، بمعنی فن مصوری ، art یعنی فن ، ایر پورٹ (Air-port)، میگزین (Magazine) اور پالیسی (Policy) وغیرہ۔ یہاں مفہومی اور آزاد ترجمہ کی مثال غالبؔ کے خطوط سے یوسف مرزا کو لکھے گئے خط کے اقتباس سے یہاں دی جاتی ہے۔

''یوسف مرزا،

کیوں کر لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا، اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر؟ یہ ایک شیوہ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں، اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ، بھلا کیونکر نہ تڑپے گا۔ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں، دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا پھر باپ مرا۔ مجھ سے کوئی پوچھے کہ بے سروپا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا کہ یوسف مرزا کو۔''

Yousaf Mirza,

How can i write that your father died, and i write what further in can write that what should you do now but patience? it is an old custom of living persons. Condolence is done like this only and only it is said that be patient. Alas! one's liver has been cut off and people say to him that you should not be restless, why he will not be restless. Suggestion is not given in this matter. Prayer has no connection and medicine does not real. Firstly the son died and then father died. Someone should ask me that who is called a 'head and foot-less person' then i shall say 'to Yousaf Mirza."

'شیوۂ فرسودہ' اور 'ابنائے روزگار' مشکل الفاظ ہیں۔ 'شیوہ' چلن یا طریقہ کے لئے آتا ہے اور فرسودہ کے معنی 'پرانا' کے لئے دقیانوسی جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ 'اِبن' عربی میں بیٹے کو کہتے ہیں اور اِبنائے روزگار (زندہ لوگوں) سے روزی کمانے والے بیٹے یعنی سبھی زندہ لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لفظ 'پا' مطلب 'پیر' ہوتا ہے۔ 'بے سروپا' کا مطلب بغیر سر اور پیر کے۔

شیوۂ فرسودہ کے لئے 'old custom' کی جگہ Conservative tradition بھی استعمال ہوسکتا تھا اور ابنائے روزگار کے لئے living person کی جگہ men of business بھی لکھا جاسکتا تھا۔ 'بے سروپا' کے لئے 'head and footless' کو آزادانہ طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اگر head کی جگہ top اور foot کی جگہ Bottom لکھتے تو Head and bottamless لکھنے پر مفہوم تو ادا ہو جاتا لیکن معنی کی برجستگی ترجمہ شدہ شکل میں صاف طور پر سامنے نہ آپاتی۔ مثالیہ عبارت میں Tense (زمانہ) کی پہچان ضروری ہے۔ 'کیوں کر لکھوں

یعنی (میں کیسے لکھوں؟ یا میں کیسے لکھ سکتا ہوں؟ (موت یا انتقال کی خبر دینا بڑا مشکل کام ہے) کیوں کر میں لفظ' کیسے' چھپا ہوا ہے اس لئے انگریزی ترجمہ میں 'can' ضرور آنا تھا۔ لفظ' کہ' کی تکرار ہے اور اس کے لئے 'That' جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ 'کہ تیرا باپ مر گیا' (ہے) اصل جملہ پورے طور پر ایسا تھا 'that your father has died' اس میں 'ہے' کو ہٹایا گیا اور ترجمہ سے 'has' کو نکال دیا گیا تب صحیح ترجمہ ہوا۔

دوسری مثال دیکھئے۔ غالب کا یہ شعر:

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

Let there be any son of mother mary

Let my wounds be healed by any

دکھ کی دوا کرنا، یا غم کی دوا کرنا محاورہ ہے۔ اس کے لئے ترجمہ میں 'wounds be healed' استعمال ہوا ہے۔ جس کا مطلب ہے زخموں کا بھر جانا۔ بظاہر محاورہ کے لئے محاورہ نہیں استعمال کیا گیا لیکن زخموں کا بھر جانا مطلب بیمار کا صحت مند ہونا ہی ہے اس لئے یہاں معنوی طور پر خوب استعمال ہوا ہے۔ یہ ترجمہ سراسر آزاد ترجمہ کی مثال ہے۔ اس میں ردیف اور قافیے کے لئے Merry اور any ترنم (rhythm) میں قائم مقام ہیں۔ مطلب یہی ہے کہ حضرت عیسٰی جو مریم کے بیٹے تھے وہ خدا کے حکم سے مردوں میں جان ڈال دیا کرتے تھے لیکن غالبؔ محبت کے مرض میں مبتلا تھے اور اس مرض کو ان کا محبوب ہی ختم کر سکتا تھا حضرت عیسٰی نہیں۔ یہ اردو ادب میں تلمیح کا شعر کہلاتا ہے جس میں کسی واقعہ کا ذکر ہوتا ہے۔

نثر کے مقابلے میں شاعری کی اصناف کا ترجمہ کرنا مشکل کام ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ پہلے تو یہ کہ شاعر شعر میں کوئی بات، خیال یا واقعہ کا ذکر کرتا ہے اُس کو شعری پیرائے میں ادا کرتا ہے یعنی علم عروض کے فن (Prosody) اور (Rhetorics) کے مطابق بیان کرتا ہے۔ ایک مشکل یہ بھی آتی ہے کہ اردو اور انگریزی

شاعری میں زبان کا استعمال علامت نگاری(Symbolism) کے لئے بھی کیا گیا ہے۔ یوں مترجم کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ باقاعدہ پورا شاعر نہ ہوسکے تو آدھا شاعر ضرور بنے تاکہ ترجمہ کا حق ادا کرسکے اور اصل عبارت کے قریب حد تک پہنچ سکے۔ اُسے بحر، ردیف، قافیہ، تصور(Imagination) اور خیال(Idia) کے علاوہ علامت نگاری اور نظم کے پس منظر یا تناظر(Context) کی بھی اچھی خاصی معلومات ہونی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اُسے شعری اصناف سخن(Genres of poetry) جیسے: نظم کے لئے Poem، غزل کے لئے Lyric، اور آزاد نظم یا نظم معریٰ یعنی Blank Verse (بحر اور اوزان کی قید سے آزاد) کا بخوبی علم ہونا چاہیے۔ غالبؔ کے شعر کی یہ ایک مثال پیش ہے جس میں دیکھنا ہے کہ ترجمہ کس حد تک کامیاب ہوا ہے اور کیا خامیاں باقی ہیں:

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

Where we were wise which technique expert
In vain dominant become enemy sky ours.

پہلے مصرعہ میں 'ہم کہاں کے دانا تھے' سے مراد 'ہم نے کبھی کوئی عقلمندی کا کام انجان نہیں دیا'، 'کس ہنر میں یکتا تھے' معنی 'ہم نے پوری زندگی کوئی فن نہیں سیکھا اور نہ ہی اسے برتا، یہ دونوں باتیں غالبؔ نے جس پس منظر میں کہی ہیں ان کا مطلب بالکل اُلٹا ہے۔ وہ بڑے ذی شعور، ذی حس اور ہوشیار شخص تھے، اگر شراب پینے کی عادت نہ ہوتی ولی اللہ ہوتے۔ شاعروں میں شاعر اور آدمی سے زیادہ اعلیٰ درجہ کے انسان تھے۔ اس ہنر میں وہ کامل اور یکتا تھے۔ دوسرے مصرعہ میں دشمن آسمان سے مراد لوگوں کی کم عقلی اور ناسمجھی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ غالبؔ کو اپنی زندگی میں ان کے شاعرانہ فن کی داد خاطر خواہ نہ ملی اور ان کے انتقال کے بعد لوگوں نے ان کے فن اور رتبہ کو سمجھا۔

پہلے مصرعہ میں دانا (عقلمند) کے لئے wise اور ہنر (کسی کام کی صلاحیت، پیشہ وارانہ صلاحیت جیسے دستکاری(Handicraft) کے لئے technique اور یکتا کے لئے 'expert' صحیح استعمال کیا گیا ہے۔ دوسرے

مصرعے میں غالبؔ کو بطور تخلص Pseudonym (قلمی نام) استعمال نہیں کیا گیا بلکہ لغوی معنی غالب آجانا، کثرت میں ہونا استعمال کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہاں غالبؔ کو تخلص کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور غالبؔ اپنے اوپر پڑنے والی بے بنیاد مصیبتوں کی شکایت کررہے ہیں۔

اب ترجمہ میں متعدد اصطلاحات کا استعمال ہوتا ہے اور ترجمہ نگار ان کا مناسب مقام پر ان کا استعمال بھی کرتا ہے۔ اصطلاحات کے علاوہ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ انگریزی زبان میں اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اردو کا یہ جملہ دیکھئے: 'حراست میں لے لیا گیا' کے معنی ہیں 'گرفتار کرلیا گیا' نکلتا ہے۔ انگریزی میں Taken into custody کی جگہ صرف Arrested لکھنے سے بات مکمل ہوجاتی ہے۔ اگر انگریزی یہ حروف گن کر دیکھیں تو پہلی صورت میں 16 حروف استعمال ہوئے اور دوسری صورت میں صرف 8 حرفی لفظ لکھ کر ہم نے مطلب پورا کردیا۔ یعنی آدھے حروف یا ایک لفظ میں بات بن گئی۔ ترجمہ نگار کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ ترجمہ کرتے وقت اختصار کے اس اصول کو ہمیشہ اپنائے اور فنکارانہ طور پر استعمال کرے۔ صحافی حضرات (Journalists) فن مختصر نویسی (Art of short hand) کا زیادہ استعمال کرتے ہیں۔

11.5 نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال نمبر 1:۔ اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو ترجمہ کے فنی اصول کی نشاندہی کیجئے۔

سوال نمبر 2:۔ منظوم ترجمہ اور نثری ترجمہ کے فنی امتیازات پر اظہار خیال کیجئے۔

11.6 امدادی کتب

1 انگریزی ترجمہ کا فن، از محمد طیب دہلوی، رومانہ پبلیکیشنز، دہلی۔

2 ترجمہ کاری، از ڈاکٹر فاخرہ نورین، ادارۂ تحقیقات اردو، اسلام آباد

اکائی نمبر 12: نظم/نثر (اقتباس)

ساخت:

12.1 تمہید

12.2 مقاصد

12.3 نظم/نثر (اقتباس)

12.3.1 نثر

12.3.2 نظم

12.4 عمومی جائزہ

12.5 سوالات

12.6 امدادی کتب

12.1 تمہید

اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہر طرح کے نثری پیرائے موجود ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ اردو نثر کی اصناف سخن نے بہت کچھ انگریزی نثر کی اصنافِ سخن سے اخذ کیا ہے۔لسانیات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ ایک ادیب یا نثر نگار اپنی طرز تحریر کے مخصوص انداز سے جن چنیدہ الفاظ کا استعمال کر کے اپنی تخلیق پیش کرتا ہے وہ اس کا اسلوب کہلاتا ہے۔ زبان کے کسی بھی دور کا کوئی سا بھی ادیب یا نثر نگار اپنے اسلوب سے پہچانا جاتا ہے۔اردو نثر پاروں کا انگریزی زبان میں کما حقہ ترجمہ کرنے سے پہلے ہمیں ان دونوں زبانوں کی ادبی روایت اور تاریخ کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ ترجمہ کا تعلق ہر طرح کی تحریر سے ہوتا ہے اور تحریر زبان کی وجہ سے وجود میں آتی ہے اور زبان

کا اظہار دنیا کے تہذیب یافتہ ملکوں میں وہاں کے اخبارات، رسالے اور مختلف کتابوں کی صورت میں ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔اس روئے کائنات میں موجود کوئی بھی چیز جس کا تعلق انسان سے ہو وہ ترجمہ کا موضوع بن سکتی ہے۔بشرطیکہ اس کا ذکر کسی کتاب، اخبار، رسالے یا تقریر میں آچکا ہو۔

اردو نثر میں ترجمہ کی روایت پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں فارسی، عربی اور انگریزی سے ترجمہ ہوئے اور اردو سے ہندی میں ہوئے ترجموں کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔ دہلی کالج، فورٹ ولیم کالج اور دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد کی خدمات اس سلسلہ میں قابل ذکر ہیں۔غیر ادبی مضامین جیسے سائنس، تاریخ اور تعلیم (درس و تدریس) میں بھی وہ کتابیں مل جاتی ہیں جو اردو میں ترجمہ کر کے تحریر کی گئیں۔

نثر کے مقابلے نظم یا شاعری کی دوسری اصناف کا ترجمہ مشکل کام ہے۔انگریزی میں منظوم ترجمہ کرنے والے کو اردو شاعری کی روایت اور فن سے معلومات ہونے کے علاوہ انگریزی میں شاعری، انگریزی شاعری کی روایت اور فن کی اچھی خاصی واقفیت ہونی ضروری ہے۔کیوں کہ اردو شاعری کی کچھ اصناف انگریزی میں موجود نہیں ہیں اسی طرح انگریزی شاعری کی کچھ اصناف اردو میں موجود نہیں ہیں۔جیسے 'منقبت' اور 'نعت' انگریزی میں موجود نہیں ہیں۔اللہ تعالیٰ کی شان میں جو نظم 'حمد' کے طور پر لکھی جائے اس کا قائم مقام تصور بالکل وہ نہیں ہے جیسا کہ 'hymns' میں دیکھنے کو ملتا ہے۔نعت محمد ﷺ کے لئے اور منقبت حضرت علیؓ کے لئے مستعمل ہے۔غزل کو پورے طور پر Sonnet نہیں کہہ سکتے کیوں کہ انگریزی میں Sonnet کا الگ مفہوم بھی موجود ہے۔غزل کو lyric نظم کہا جاسکتا ہے۔مرثیہ/نوحہ کے لئے Elegy اور قصیدے کے لئے Ode کا استعمال کیا جاتا ہے۔تشبیہ کے لئے Simile اور استعارہ کے لئے Metaphor کا استعمال ہوتا ہے۔فصاحت کے لئے Elopuence اور بلاغت کے لئے Rhetorics جیسی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔صنعتِ تجنیس (Alliteration) بھی Rhetorics کا ایک حصہ ہے۔اس کے علاوہ رباعی کو Quatrain کہتے ہیں۔

12.2 مقاصد

جیسا کہ پچھلی اکائیوں میں ترجمہ کے فن اور اصول ولوازمات پر بات ہوتی آئی ہے۔اس اکائی میں نثر اور نظم کے اقتباس کا عملی طور پر ترجمہ پیش کیا جائے گا جس سے طلباء کو ترجمہ کاری کے طریقہ کار سے آگہی حاصل ہوگی۔

12.3 نظم ونثر (اقتباس)

12.3.1 نثر

1۔ (اردو اقتباس)

ایک دفعہ کی بات ہے کہ ایک عورت کے چار بچے تھے، دولڑکے اور دولڑکیاں۔گرمی میں ایک دن تیسرے پہر وہ اپنے بستر پر سو رہی تھی۔اس نے کچھ عمدہ سیب اور دوسرے پھل خریدے تھے جنہیں اس نے اپنے کمرے میں ایک اُونچی الماری کے اوپر ایک ٹوکری میں رکھ دیا تھا۔سب سے بڑے لڑکے نے ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔وہ بہت لالچی تھا۔اس نے پھلوں کو چرا کر اکیلے ہی کھا لینے کی خواہش کی۔وہ چپکے سے کمرے میں گھستا اور اس نے دیکھا کہ الماری اونچی ہے اور اس لئے وہ ٹوکری تک نہیں پہنچ سکتا۔وہ کھڑا ہونے کے لئے ایک اسٹول لایا۔اُس نے ٹوکری کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن گر پڑا۔پھل بھی فرش پر بکھر گئے۔ماں نیند سے چونک کر اُٹھی اور وہ سب کچھ جان گئی۔اس نے لڑکے کو چوری کرنے کے جرم میں دیوار کی طرف منہ کر کے اسٹول پر کھڑا کر دیا اور پھل اپنے دوسرے بچوں کو بانٹنے لگی۔

(English Translation)

Once a lady had four children-two sons and two doughters. On a hot day she was sleeping in her bed in the afternoon. She had bought some nice apples and other fruits which she placed in a basket on a high sheilf in her room. The eldest son had seen her doing so. He was very greedy. He desired to steal the fruits and eat them lonely. He stealthily entered the room and saw that the shelf

was high and as such the basket of fruits was not within his reach. He brought a stool to stand upon. He strived very much to take hold of the basket but fell down. The fruits also scattered over the floor. The mother was startled from sleep and she knew what had happened. She made the boy stand upon the stool facing the wall in the act of stealing and began to distribute the fruits among her other children.

2۔ (اردو اقتباس)

ایک مرتبہ ایک بارہ سینگا ایک پل پر سے دریا پار کر رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر صاف بہتے ہوئے پانی میں اپنے سائے پر پڑی اور وہ اپنی خوبصورتی کو سراہنے کے لئے کچھ دیر وہاں رُک گیا۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا، ''میں کتنے خوبصورت سینگوں کا جوڑا رکھتا ہوں! اگر میری پتلی ٹانگیں بھی سینگوں کی طرح خوبصورت ہوتیں تو میں دنیا بھر کے جانوروں میں زیادہ خوبصورت ہوتا۔'' وہ اپنی پتلی ٹانگوں پر بہت شرمندہ ہوا۔ تبھی اُس نے شیر کی دہاڑ سنی اور وہ وہاں سے ہوا ہو گیا۔ وہ بہت تیزی سے، جنگل میں گھسا، لیکن اس کے خوبصورت سینگ ایک درخت کی گھنی شاخوں میں اُلجھ گئے۔ جس سے وہ بری طرح پھنس گیا۔ شیر اُس کے پاس پہنچا اور اُس نے جھپٹ کر اس کی زندگی تمام کر دی۔ وہی سینگ جن پر اُس کو ناز تھا وہی اس کی موت کا باعث بنے۔

(English Translation)

Once upon a time a stage was crossing a river by the bridge over it. Suddenly he saw his shadaw in clear flowing water and stopped a while to admire his beauty. He said to himself, "What a beautiful pair of horns I have! where my thin legs as beautiful as my horns, I should be the handsomest of all the animals in the world. "He was much ashamed of his thin legs. In the meanwhile he heard

the roar of a lion and was off like the world. He, very rapidly, dashed into the forest, but his splendid horns were entangled in the thick branches of a tree. As a result he was held fast. The lion reached upto him, sprang and put his life to an end. The horns which he had admired so much had been the main cause of his death.

3۔ (اردو اقتباس)

ایشر سنگھ نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا: ''کوئی بھی نہیں کلونت! کوئی بھی نہیں۔۔۔۔''

کلونت کور نے اپنے بھرے ہوئے کولھوں پر ہاتھ رکھ کر ایک عزم کے ساتھ کہا: ''ایشر سیاں، میں آج جھوٹ سچ جان کے رہوں گی۔۔۔۔کھاوا گھورو جی کی قسم۔۔۔۔

کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں؟''

ایشر سنگھ نے کچھ کہنا چاہا مگر کلونت کور نے اس کو اجازت نہ دی: ''قسم کھانے سے پہلے سوچ لے کے میں بھی سردار نہال سنگھ کی بیٹی ہوں۔۔۔۔تکا بوٹی کر دوں گی، اگر تو نے جھوٹ بولا۔۔۔۔لے اب کھاوا گھورو جی کی قسم۔۔کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں۔۔۔؟''

ایشر سنگھ نے بڑے دکھ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔کلونت کور بالکل دیوانی ہوگئی۔اس نے لپک کر کونے میں سے کرپان اُٹھائی، میان کو کیلے کے چھلکے کی طرح اتار کر ایک طرف پھینکا اور ایشر سنگھ پر وار کر دیا۔

آن کی آن میں لہو کے فوارے چھوٹ پڑے۔کلونت کور کی اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو اس نے وحشی بلیوں کی طرح ایشر سنگھ کے کیس نوچنے شروع کر دیے۔ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی نامعلوم سوت کی موٹی موٹی گالیاں دیتی رہی۔ایشر سنگھ نے تھوڑی دیر کے بعد نقاہت بھری التجا کی: ''جانے دے اب کلونت، جانے دے۔۔۔!''

اس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔کلونت کور پیچھے ہٹ گئی۔

خون ایشر سنگھ کے گلے سے اُڑ اُڑ کر اس کی مونچھوں پر گر رہا تھا۔اس نے اپنے لرزاں ہونٹ کھولے اور کلونت کور کی طرف شکریے اور گلے کی ملی جلی نگاہوں سے دیکھا: ''میری جان! تم نے بہت جلدی کی۔۔لیکن جو ہوا، ٹھیک

ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''

کلونت کور کا حسد پھر بھڑکا: ''مگر وہ کون ہے تمہاری ماں؟''

لہو ایشر سنگھ کی زبان تک پہنچ گیا۔ جب اس نے اس کا ذائقہ چکھا تو اس کے بدن میں جُھرجُھری سی دوڑ گئی۔

(English Translation)

Ishar Singh replied in a tired tone, 'No one, Kulwant and said firmly, 'Ishar Singh, today I'd find out the truth .... by god, in there no woman at the root of all this?'

Ishar Singh moved his head in affirmation very painfully. Kulwant Kour went mad. She leaped, picked up the sword lying in a corner, peeled off the sheath and attacked Ishar Singh.

Instantly, there were fountains of blood all round. Kulwant Kour was not satisfied with even this and like a wild cat she started pulling his hair. At the same time, she was abusing her rival in the most foul language. After a while, Ishar Singh pleaded with her, 'Let it be now, let it be .....' His voice was full of extreme pain. Kulwant Kour moved away.

The blood flew from Ishar Singh's neck and fell on and fell on his moustache. He opened his limp lips and saw towards Kulwant Kour with mixed feelings of thanks and complaint, is o.k....'

Kulwant Kaur's anger was on the boil again, 'but who is that fucking bitch?'

Blood had by now reached Ishar Singh's tongue. When he tasted it, a shiver ran through his body.

3۔ (اردو اقتباس)

فورٹ ولیم کالج صرف تصنیف و تالیف یا ترجمہ کا ہی کام نہیں انجام دیتا تھا بلکہ اس کے کئی شعبے تھے۔ مثلاً: تعلیم و تدریس، کتب خانہ اور پریس وغیرہ۔ اس کالج میں اردو کے علاوہ عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت کی کتابیں لکھی گئیں اور ان زبانوں کی کتابوں سے اردو میں ترجمہ کا کام بھی ہوا۔ اگر چہ فورٹ ولیم کالج کا قیام خالص سیاسی اغراض کی تکمیل کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ عمل میں آیا تھا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے ذریعہ اردو زبان کی جو ترقی شعوری طور پر ہوئی اسے اردو زبان کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

(English Translation)

Fort William college used to do not only the work of writing, compiling or traslating but it had many departments. For example: education and teaching, library and printing press etc. Apart from Urdu, books in Arabic, Persian, Hindi and Sanskrit were written in this college and translation work from written in this college and translation work from these language books was also done in Urdu. Though Fort Company, purely to fulfil the political purposes, but it can not be denied that through it whatever development Urdu Language in a consciously or uncousciously manner gained, history of Urdu language can never forget it.

12.3.2 نظم

اکبرالہ آبادی نے اپنی شاعری میں انگریزی زبان کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ان کے ہی اشعار ترجمہ کے لئے پیش ہیں:

گو کہ وہ کھاتے پُڈنگ اور کیک ہیں
پھر بھی نہایت سیدھے اور نیک ہیں
جب میں اُن سے کہتا ہوں گومی کس ڈیر
سر جھکا کے کہتے یو مے ٹیک ہیں

ان اشعار کا ترجمہ اس طرح سے ہے:

Though he eats puddinf and cake
Still he is simple and not a rake
When I say to him give me kis dear
Bending his head says that you may take

☆☆☆☆☆

کتنے شریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

How sweet are your lips that rival
Not became distasteful after abused

☆☆☆☆☆

واعظ نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

Preacher neither you drink not could offer to someone
How wonderful purifying wine is yours

☆☆☆☆☆

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

Even if we sigh then we earn a bad name
Even if they commit murder then no rumour spreads

☆☆☆☆☆

تیرے شیشے میں مے باقی نہیں ہے
بتا کیا تو میرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

There is no wine left in your glass
tell, are you not my cup-bearer
A thirsty fellow gets a dew drop from the ocean
It is simply an act of misery, not the work of food giving.

☆☆☆☆☆

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں، زندگی دشوار ہوجائے

I pass through laughing playing with tide of accidents
If there are conveniences life may became difficult

☆☆☆☆☆

پتھروں کے شہر میں نہ چھوڑو مجھے
آئینے کی طرح میں بکھر جاؤں گا

Don't leave me in the city of stones
I shall be shattered like the mirror

☆☆☆☆☆

poem

Momentries

by Mata Prasad Shukl-Lashkar

They

Fly

Pigeon in the day

Hen in the night

call

Themselves

the followers of

non-violence

We

are becoming thorn after

dried

because

We have blood relation

with them

therefore

they are

Drinking our blood

are the followers of non

violence

Drink water after distilling

Blood of poors

Drink wothout hesitation

وہ

دن میں کبوتر

رات میں مُرغی

اُڑاتے ہیں

خودکو

عدم تشدد کا پُجاری

بتاتے ہیں

ہم

سوکھ کر کانٹا ہو رہے ہیں

کیونکہ

اُن سے ہمارا خون کا رشتہ ہے

اس لئے

وہ ہمارا

خون پی رہے ہیں

عدم تشدد کے پُجاری ہیں

پانی چھان کر پیتے ہیں

غریبوں کا خون

بے ہچک پیتے ہیں

☆☆☆☆☆

12.5 نمونہ برائے امتحانی سوالات

سوال نمبر 1:۔ نصاب میں شامل کسی ایک نثری اقتباس کا اردو ترجمہ کیجئے۔

سوال نمبر 2:۔ نصاب میں شامل کوئی دو اشعار کا انگریزی ترجمہ کیجئے۔

سوال نمبر 3:۔ نصاب میں شامل نظم کا اردو ترجمہ کیجئے۔

12.6 امدادی کتب

1۔ وضع اصطلاحات، از وحیدالدین سلیم

2۔ مغرب سے نثری تراجم، از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

3۔ اردو میں ترجمے کی روایت، از قمر رئیس

4۔ ترجمے کا فن (نظری مباحث) ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

5۔ انگریزی ترجمہ کا فن، از محمد طیب دہلوی، رومانہ پبلیکیشنز، دہلی۔

6۔ ترجمہ کاری، از ڈاکٹر فاخرہ نورین، ادارۂ تحقیقات اردو، اسلام آباد

ASSIGNMENT QUESTIONS:

M.A. Urdu	Semester-I
Course No: Urd-106	M.Marks: 20

نوٹ: مندرجہ ذیل سوالات میں سے کوئی دو سوالات کے جوابات لکھنا لازمی ہیں۔

سوال نمبر 1:۔ ترجمہ کی تعریف، فن اور اقسام قلم بند کیجئے۔

سوال نمبر 2:۔ نثری اور منظوم ترجمہ کے فرق کو واضح کیجئے۔

سوال نمبر 3:۔ اردو سے انگریزی یا انگریزی سے اردو ترجمہ کاری کے اصول اور طریقہ کار کی نشاندہی کیجئے۔

Course Contributores and Content Editing:

Dr. Ajaz Hussain Shah
Lecturer, Deptt. of Urdu, University of Jammu. (Uint-I to III)

Dr. Liaqat Ali
Inch. Teacher Urdu. DDE, Jammu University. (Unit-IV)

Content Editing: Dr. Liaqat Ali
Lecturer in Urdu. DDE, Jammu University. (Unit-I to IV)

© Directorate of Distance Education, University of Jammu, Jammu 2019

* All rights reserved. No part of this work may be reproduced in any form, by mimeograph or any other means, without permission in writing from the DDE, University of Jammu.

* The script writer shall be responsible for the lesson/script submitted to the DDE and any plagiarism shall be his/her entire responsibility.

Printed By : M/S Rohini Printers/800

DIRECTORATE OF DISTANCE EDUCATION
UNIVERSITY OF JAMMU
JAMMU

SELF INSTRUCTION MATERIAL
M.A. URDU (SEMESTER FIRST)

COURSE NO: 106 (THE ART OF TRANSLATION)

UNIT I-IV **LESSON : 1-12**

PROF. (DR.) SHOHAB INAYAT MALIK COORDINATOR P.G. URDU

DR. LIAQAT ALI INCHARGE TEACHER (URDU)

http:/www.distanceeducationju.in

(C) All copyright privileges of the material vest with the Directorate of Distance Education, University of Jammu, Jammu-180006